افسانے

کرشن چندر

پانی کا درخت

نیا ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پانی
کا
درخت

کرشن چندر

* زندگی کے موڑ پر (طویل مختصر افسانے)
* ان داتا (افسانے)
* تین غنڈے (افسانے)
* ٹوٹے ہوئے تارے (افسانے)
* طلسم خیال (افسانے)
* غدار (ناول)
* ربڑ کی عورت (افسانے)

افسانے

کرشن چندر

پانی کا درخت

نیا ادارہ

۱۵ - سرکار روڈ - لاہور

بار اول : ۱۹۶۸ء

طابع و ناشر : نذیر احمد چودھری
نیا ادارہ — سویرا آرٹ پریس — لاہور

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کریں

افسانے

پانی کا درخت

جہاں ہمارا گاؤں ہے اس کے دونوں طرف پہاڑوں کے روکھے سوکھے سنگلاخی سلسلے ہیں۔ مشرقی پہاڑوں کا سلسلہ بالکل بے ریش و برودت ہے۔ اس کے اندر نمک کی کانیں ہیں۔ مغربی پہاڑی سلسلے کے چہرے پر جنڈ، بہیکڑ، املتاس اور کیکر کے درخت اگے ہوئے ہیں۔ اس کی چٹانیں سیاہ ہیں لیکن ان سیاہ چٹانوں کے اندر میٹھے پانی کے دو بڑے قیمتی چشمے ہیں؛ اور ان دو پہاڑی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی تلہٹی پر ہمارا گاؤں آباد ہے۔

ہمارے گاؤں میں پانی بہت کم ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے اپنے گاؤں کے آسمان کو تپتے ہوئے پایا ہے، یہاں کی زمین کو ہانپتے ہوئے دیکھا ہے اور گاؤں والوں کے محنت کرنے والے ہاتھوں اور چہروں پر ایک ایسی ترسی ہوئی بھوری چمک دیکھی ہے جو صدیوں کی ناآسودہ پیاس سے پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے گاؤں کے مکان اور آس پاس کی زمین بالکل بھوری اور خشک نظر آتی ہے۔ زمین میں باجرے کی فصل جو ہوتی ہے اس کا رنگ بھی بھورا بلکہ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے گاؤں کے کسانوں اور ان کے کپڑوں کا ہے۔ صرف ہمارے گاؤں کی عورتوں کا رنگ سنہری ہے کیونکہ وہ چشمے سے پانی

لاتی ھیں ۔

بچپن ھی سے میری یادیں پانی کی یادیں ھیں : پانی کا درد اور اس کا تبسم ؛ اس کا ملنا اور کھو جانا ۔ یہ سینہ اس کے فراق کی تمہید اور اس کے وصال کی تاخیر سے گودا ھؤا ھے ۔

مجھے یاد ھے جب میں بہت چھوٹا سا تھا تو دادی اماں کے ساتھ گاؤں کی تلہٹی کے نیچے بہتی ھوئی رویل ندی کے کنارے کپڑے دھونے کے لیے جایا کرتا تھا ۔ دادی اماں کپڑے دھوتی تھیں میں انھیں سکھانے کے لیے ندی کے کنارے چمکتی ھوئی بھوری ریت پر ڈال دیا کرتا ۔ اس ندی میں پانی بہت کم تھا ۔ یہ بڑی دبلی پتلی ندی تھی ۔ چھریری اور آھستہ خرام جیسے ھمارے سردار پیندا خاں کی لڑکی بانو ۔ مجھے اس ندی کے ساتھ کھیلنے میں اتنا ھی لطف آتا تھا جتنا بانو کے ساتھ کھیلنے میں ۔ دونوں کی مسکراھٹ میٹھی تھی ؛ اور مٹھاس کی قدر وھی لوگ جانتے ھیں جو میری طرح نمک کی کان میں کام کرتے ھیں ۔

مجھے یاد ھے ھماری رویل ندی سال میں صرف چھ مہینے بہتی تھی ، چھ مہینے کے لیے سوکھ جاتی ۔ جب چیت کا مہینہ جانے لگتا تو ندی سوکھنا شروع ھوتی اور جب بیساکھ ختم ھونے لگتا تو بالکل سوکھ جاتی ، اور پھر اس کی تہ پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے نیلے پتھر رہ جاتے یا نرم نرم کیچڑ جس میں چلنے سے یوں معلوم ھوتا تھا جیسے ریشم کے دبیز غالیچے پر گھوم رھے ھوں ۔

چند دنوں میں ھی ندی کا کیچڑ بھی سوکھ جاتا اور اس کے چہرے پر باریک درزوں اور جھریوں کا جال پھیل جاتا ۔

کسی محنتی کسان کے چہرے کی طرح اس کے ہونٹوں پر خشک پپڑیاں جم جاتیں اور ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کی گرم گداز ریت نے سالہا سال سے پانی کی ایک بوند نہیں چکھی۔

مجھے یاد ہے پہلی بار جب میں نے ندی کو اس طرح سوکھتے ہوئے پایا تھا تو بالکل بے چین اور پریشان ہوگیا تھا ، اور اس رات سو بھی نہ سکا تھا ۔ اس رات دادی اماں مجھے بہت دیر تک گود میں لے کر عجیب عجیب کہانیاں سناتی رہیں اور ساری رات دادی اماں کی گود میں لیٹے لیٹے مجھے رویل ندی کی بہت سی پیاری پیاری باتیں یاد آنے لگیں : اس کا ہولے ہولے پتھروں سے ٹھمکتے ہوئے چلنا ، اور پتھروں کے درمیان سے اس کا ذرا تیز ہونا اور کترا کر چلنا ، جیسے کبھی کبھی بانو غصے میں گلی کے موڑ پر سے تیزی سے نکل جاتی ہے ۔ اور جہاں دو پتھر ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے تھے وہاں میں اور بانو باجرے کی ڈنڈیوں کی بنی ہوئی پن چکی لٹکا دیتے تھے اور گیلا آٹا پساتے تھے ۔ پن چکی ندی کی آہستہ خرامی کے باوجود کیسے کیسے تیز تیز چکر لگا کر گھومتی تھی ۔ اور اب یہ ندی سوکھ گئی ۔

ان سب باتوں کو یاد کرکے میں نے دادی اماں سے پوچھا :

" دادی اماں یہ ہماری ندی کہاں چلی گئی ؟ "

" زمین کے اندر چھپ گئی ۔"

" کیوں ؟ "

" سورج کے ڈر سے ۔"

" کیوں ؟ یہ سورج سے کیوں ڈرتی ہے ؟ سورج تو بہت اچھا ہوتا ہے ۔"

" سورج ایک نہیں ہے بیٹا ، دو سورج ہیں ۔ ایک تو سردیوں کا سورج ہے ، وہ بڑا اچھا اور مہربان ہوتا ہے ۔ دوسرا سورج گرمیوں کا ہے ۔ یہ بڑا تیز ، چمکیلا اور غصے والا ہوتا ہے ، اور یہ دونوں باری باری ہر سال ہمارے گاؤں میں آتے ہیں ۔ جب تک تو سردیوں کا سورج رہتا ہے ہماری ندی اس سے بہت خوش رہتی ہے ، لیکن جب گرمیوں کا ظالم سورج آتا ہے تو ہماری ندی کے جسم سے اس کا لباس اتارنا شروع کرتا ہے ۔ ہر روز کپڑے کی ایک تہ اترتی چلی جاتی ہے اور جب بیساکھ کا آخری دن آتا ہے تو ندی کے جسم پر پانی کی ایک پتلی سی چادر رہ جاتی ہے ۔ اس رات کو ہماری ندی شرم کے مارے زمین میں چھپ جاتی ہے اور انتظار کرتی ہے سردیوں کے سورج کا جو اس کے لیے اگلے سال پانی کی نئی پوشاک لائے گا ۔"

میں نے آنکھ جھپکتے ہوئے کہا : " سچ مچ گرمیوں کا سورج تو بہت برا ہے ۔"

" لو اب سو جاؤ بیٹا ۔"

مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں نے ایک اور سوال پوچھا : " دادی اماں یہ ہمارے نمک کے پہاڑ کا پانی کیوں کڑوا ہے ؟ "

ہمارے گاؤں میں بچے پانی کے لیے بہت سوال کرتے ہیں ۔ پانی ان کے تخیل کو ہمیشہ اکساتا رہتا ہے ۔ دوسرے گاؤں میں ، جہاں پانی بہت ہوتا ہے ، وہاں کے لڑکے شاید سونے کے جزیرے ڈھونڈتے ہوں گے یا پرستان کا رستہ تلاش کرتے ہوں گے لیکن ہمارے گاؤں کے بچے ہوش سنبھالتے ہی پانی کی تلاش میں نکل

پڑتے ھیں اور تلہٹی پر اور پہاڑی پر دور دور تک پانی کو ڈھونڈنے کا کھیل کھیلتے ھیں ۔ میں نے بھی اپنے بچپن میں پانی کو ڈھونڈا تھا اور نمک کے پہاڑ پر پانی کے دو تین نئے چشمے دریافت کیے تھے۔ مجھے آج تک یاد ھے میں نے کتنے چاؤ اور خوشی سے پانی کا پہلا چشمہ ڈھونڈا تھا ؛ کس طرح کانپتے ھوئے ھاتھوں سے میں نے چٹانوں کے درمیان سے جھجھکتے ھوئے پانی کو اپنی چھوٹی چھوٹی آنگلیوں کا سہارا دے کر باھر بلایا تھا ۔ اور جب میں نے پہلی بار اسے اپنی اوک میں لیا تو پانی میرے ھاتھ میں یوں کانپ رھا تھا جیسے نو گرفتار چڑیا بچے کے ھاتھوں میں کانپتی ھے ۔

پھر جب میں اسے اوک میں بھر کر اپنی زبان تک لے گیا تو مجھے یاد ھے میری کانپتی ھوئی خوشی کیسے تلخ آچھو میں تبدیل ھو گئی تھی ۔ پانی نے زبان پر جاتے ھی بچھو کی طرح ڈنک مارا ، اور اس کے زھر نے میری روح تک کو کڑوا کر دیا ۔ میں نے پانی تھوک دیا اور پھر کسی نئے چشمے کی تلاش میں چل کھڑا ھؤا ، لیکن نمک کے پہاڑ پر مجھے آج تک میٹھا چشمہ نہ ملا ۔ اس لیے جب ندی سوکھنے لگی تو میٹھے چشمے کی یاد نے مجھے بے چین کر دیا اور میں نے دادی اماں سے پوچھا : " دادی اماں یہ نمک کے پہاڑ کا پانی کڑوا کیوں ھے ؟"

دادی اماں نے کہا : " یہ تو ایک دوسری کہانی ھے ۔"

" تو سناؤ ۔"

" نہیں اب سو جاؤ ۔"

" نہیں سناؤ ، نہیں تو ھم روئیں گے ۔"

" اچھا بابا سناتی ھوں ، مگر تم اب چیخو گے نہیں ۔"

" نہیں ۔"

" اور نہ ھی بیچ بیچ میں ٹوکو گے ۔"

" نہیں ۔"

" اچھا تو سنو ۔ یہ تم اس طرف نمک کی پہاڑی جو دیکھتے ھو یہ پرانے زمانے میں ایک عورت تھی جو اس پہاڑ کی بیوی ھے ، جہاں آج کل میٹھے پانی کے چشمے ھیں ۔"

" پھر ؟ "

" پھر ایک روز دیووں میں بڑی جنگ چھڑی اور یہ سامنے کا پہاڑ بھی ، جو اس عورت کا خاوند تھا ، جنگ میں بھرتی ھو گیا اور بیوی کو پیچھے چھوڑ گیا اور اسے کہہ گیا کہ وہ اس کے آنے تک کہیں نہ جائے ، نہ کسی سے بات کرے ، صرف اپنے گھر کا خیال کرے ۔"

" اچھا ۔"

" ھاں ۔ پھر کئی سال تک بیوی اپنے دیو خاوند کا انتظار کرتی رھی لیکن اس کا خاوند جنگ سے نہ لوٹا ۔ آخر ایک دن اس کے گھر میں ایک سفید دیو آیا اور اس پر عاشق ھو گیا ۔"

" عاشق کسے کہتے ھیں ؟ "

دادی اماں رک گئیں ، بولیں : " تو نے پھر ٹوکا ۔"

میں نے دل میں سوچا : دادی اماں اگر خفا ھو گئیں تو باقی کہانی سننے کو نہیں ملے گی ، اور کہانی اب دلچسپ ھوتی جا رھی ھے اس لیے چپکے سے سن لینا چاھیے ، عاشق کا مطلب بعد میں پوچھ لیں گے ۔ اس لیے میں نے جلدی سے سوچ کر دادی

اماں سے کہا : " اچھا اچھا ، دادی اماں آگے سناؤ ، اب نہیں ٹوکیں گے ۔"

دادی اماں بڑی رکھائی سے اس طرح خفا ہو کے بولیں جیسے انھیں کہانی کا آگے آنے والا حصہ پسند نہیں ہے ۔

کہنے لگیں : " ہونا کیا تھا ، مغربی پہاڑ کی بیوی بے وفا نکلی ۔ جب اسے سفید دیو نے جھوٹ موٹ یقین دلا دیا کہ اس کا پہلا خاوند دیووں کی جنگ میں مارا گیا ہے تو اس نے سفید دیو سے شادی کر لی ۔"

" دیووں کی جنگ کیوں ہوئی تھی ؟ " میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا ۔

" تو نے پھر ٹوکا ۔" دادی اماں بہت خفا ہو کے بولیں ، " چل اب آگے نہیں سناؤں گی ۔"

" نہیں دادی اماں ، میری اچھی دادی اماں ۔ اچھا اب ، اب بالکل نہیں ٹوکوں گا ۔" میں نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا ۔ " پھر ؟ "

" پھر ایک دن بہت سالوں کے بعد ایک بوڑھا دیو اس وادی میں آیا ۔ یہ اسی عورت کا پہلا خاوند تھا ۔ جب اس نے اپنی بیوی کو سفید دیو کے ساتھ دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے کلہاڑا لے کر سفید دیو اور اپنی بیوی کو قتل کر دیا ۔ جب سے ان دونوں پہاڑوں کو بڑے پیر کی بد دعا ملی ہے اور یہ لوگ سل پتھر ہو گئے ہیں ۔ سامنے والے پہاڑ کا پانی اس لیے میٹھا ہے کیونکہ اسے اپنی بیوی سے سچی محبت تھی ۔ اس کے مقابل پہاڑ کا پانی کھارا ہے اور اس میں نمک ہے کیونکہ وہ

عورت ہے اور اپنی بے وفائی پر ہر وقت روتی رہتی ہے اور جب اس کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں تو نمک کے ڈلے بن جاتے ہیں ، جنھیں ہر روز تمھارا باپ پہاڑ کے اندر جا کے کھود کے نکالتا ہے ۔"

" پھر ؟ "

" پھر کہانی ختم ۔"

کہانی ختم ہو گئی اور میں بھول گیا کہ میں نے کیا سوال کیا تھا ، مجھے کیا جواب ملا ۔ میں نے کہانی سن لی ، اطمینان کا سانس لیا اور پلک جھپکتے ہی سو گیا ۔ سوتے سوتے میری آنکھوں کے سامنے نمک کی کان کا منظر آیا جہاں میرے ابا کام کرتے تھے ، جہاں جوان ہو کر مجھے کام کرنا پڑا اور جہاں پہلی بار میں اپنی اماں کے ساتھ اپنے ابا کا کھانا لے کے گیا تھا ۔ افوہ ! کتنی بڑی کان تھی وہ ۔ چاروں طرف نمک کے پہاڑ ، نمک کے ستون ، نمک کے آئینے نمک کی دیواروں میں لگے ہوئے تھے ۔ ایک جگہ نمک کی بڑی جھیل تھی جس کے چاروں طرف نیلگوں دیواریں تھیں اور چھت بھی نمک کی تھی جس سے قطرہ قطرہ کر کے نمک کا پانی رستا تھا اور نیچے گر کر جھیل بن گیا تھا ۔ اور یکایک مجھے خیال آیا یہ اس عورت کے آنسو ہیں جو بڑے پیر کی بد دعا سے نمک کا پہاڑ بن چکی ہے ۔

میرے ابا اس جھیل کو دیکھ کر بولے : " یہاں اس قدر پانی ہے پھر بھی پانی کہیں نہیں ملتا ۔ دن بھر نمک کی کان میں کام کرتے کرتے سارے جسم پر نمک کی پتلی سی جھلی چڑھ جاتی ہے جسے کھرچو تو نمک چورا چورا ہو کے گرنے لگتا ہے ۔ اس

وقت کس قدر وحشت ہوتی ہے - جی چاہتا ہے کہیں میٹھے پانی کی جھیل ہو اور آدمی اس میں غوطے لگاتا جائے -"

پانی ! پانی !

پانی سارے گاؤں میں کہیں نہیں تھا - پانی نمک کے پہاڑ پر بھی نہیں تھا - پانی تھا تو سامنے پہاڑ پر جس کی محبت نے بے وفائی نہیں کی تھی - یا پانی پھر رویل ندی میں تھا - لیکن یہ ندی بھی چھ مہینے غائب رہتی تھی - اور پھر آخر ایک دن یہ بالکل ہی غائب ہو گئی اور آج تک اس کی تہ کے نیلے پتھر اور سوکھی ریت اور اس کے کنارے چلنے والی عورتوں کے ناامید قدم اس کی راہ تکتے ہیں - لیکن یہ میرے بچپن کی کہانی نہیں ہے ، یہ میرے لڑکپن کی کہانی ہے جب ہمارے گاؤں سے بہت دور ان پہاڑی سلسلوں کے دوسری طرف سینکڑوں میل لمبی جاگیر کے مالک راجہ اکبر علی خاں نے ہمارے دیہات والوں کی مرضی کے خلاف رویل ندی کا بہاؤ موڑ کر اپنی جاگیر کی طرف کر لیا اور ہماری تلہٹی کو اور آس پاس کے بہت سے علاقے کو سوکھا ، بنجر اور ویران کر دیا - اس وقت اس ندی کے کنارے کا ہمارا گاؤں اور اس وادی کے اور دوسرے بہت سے گاؤں یوں پریشان ہو گئے جیسے بہت سے بچے یکایک اپنی ماں کے مر جانے پر یتیم ہو جاتے ہیں - اس طرح ہمارے لیے رویل ندی مر گئی اور اس کا پانی بھی مر گیا اور ہمارے لیے ایک تلخ یاد چھوڑ گیا -

مجھے یاد ہے اس وقت گاؤں والوں نے دوسرے گاؤں والوں سے مل کر سرکار کو ایک عرضی دی تھی ، راجہ اکبر علی خاں

کے ظلم کے خلاف ، اور سرکار سے اپنی کھوئی ہوئی ندی مانگی تھی کیونکہ ندی تو گھر کی عورت کی طرح ہے ۔ وہ گھر میں پانی دیتی ہے ، کھیتوں میں کام کرتی ہے ، ہمارے کپڑے دھوتی ہے ، جسم کو صاف رکھتی ہے ۔ ندی کے گیت اس کے بچے ہیں جنھیں وہ لوری دیتے ہوئے ، تھپکتے ہوئے مغرب کے جھولے کی طرف لے جاتی ہے ۔ پانی کے بغیر ہمارا گاؤں بالکل ایسا تھا جیسے گھر عورت کے بغیر ۔ گاؤں والوں کو بالکل ایسا معلوم ہؤا جیسے کسی نے ان کے گھر سے ان کی لڑکی اغوا کر لی ہو ۔ وہی غم ، وہی غصہ تھا ، وہی تیور تھے ، وہی مرنے مارنے کے انداز تھے ۔

لیکن راجہ اکبر علی خاں چکوال کے علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا ۔ حکومت کے افسروں کے ساتھ اس کا گہرا رسوخ تھا ۔ نمک کی کان کا ٹھیکہ بھی اس کے پاس تھا ۔

نتیجہ یہ ہؤا کہ گاؤں والوں کو ان کی ندی واپس نہ ملی ، اُلٹا ہمارے بہت سے گاؤں والے ، جو نمک کی کان میں کام کرتے تھے ، باہر نکال دیے گئے ۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انھوں نے اپنے گاؤں کے اغوا شدہ پانی کو واپس بلانے کی جرأت کی تھی ۔ مجھے یاد ہے اس روز ابا کانپتے کانپتے گھر میں آئے تھے ۔ ان کے چہرے کا رنگ اُڑا ہؤا تھا اور بار بار اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہتے : ” توبہ توبہ ! کیسی غلطی ہوئی ۔ وہ تو اللہ کا کرم تھا کہ میں بچ گیا ورنہ راجہ صاحب مجھے بھی نکال دیتے ۔ میں تو اب کبھی راجہ جی کے خلاف عرضی نہ دوں ، چاہے وہ پانی تو کیا میری لڑکی ہی کیوں نہ اغوا کر کے لے

جائیں ۔ توبہ توبہ ! "

اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے گاؤں میں پانی کی عزت لڑکی کی طرح بیش قیمت ہے ۔ پانی ، جو زندگی دیتا ہے ۔ پانی ، جو رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے ۔ پانی ، جو منہ دھونے کو نہیں ملتا ۔ پانی ، جس کے نہ ہونے سے ہمارے کپڑے بھورے اور میلے رہتے ہیں ، سر میں جوئیں ، جسم پر پسینے کی دھاریاں اور روح پر نمک جما رہتا ہے ۔ یہ پانی تو سونے سے زیادہ قیمتی ہے اور لڑکی سے زیادہ حسین ۔ اس کی قدر اور قیمت ہمارے گاؤں والوں سے پوچھیے جن کی زندگی پانی کے لیے لڑتے جھگڑتے گزرتی ہے ۔ ایک دفعہ سامنے کے پہاڑ کے میٹھے چشمے سے پانی لانے کے لیے سرور خاں کی بیوی سیداں اور ایوب خاں کی بیوی عائشاں دونوں آپس میں لڑ پڑی تھیں حالانکہ دونوں اتنی گہری سہیلیاں تھیں کہ ہر وقت اکٹھی رہتیں ۔ پھر بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے ۔ چشمے پر بھی پانی اکٹھے لینے جاتی تھیں ۔ پہلے ایک پھر دوسری پانی بھرتی ۔ باری باری وہ دونوں ایک دوسرے کا گھڑا اٹھا کے سر پر رکھتیں اور پھر باتیں کرتی ہوئی واپس چل پڑتیں ۔ لیکن آج نہ جانے کیا ہؤا ، آج نہ جانے دونوں کو کیا جلدی تھی ۔ ایک کہتی پہلے پانی میں بھروں گی ، دوسری کہنے لگی نہیں میں بھروں گی ۔ شاید انھیں غصہ ایک دوسرے کے خلاف نہیں تھا ۔ شاید غصہ انھیں اس لیے تھا کہ یہاں میٹھے پانی کا ایک ہی چشمہ تھا جہاں ندی کے سوکھ جانے کے بعد دور دور سے لوگ پانی لینے کے لیے آتے تھے ۔ منہ اندھیرے ہی عورتیں گھڑا لے کے چل پڑتیں ۔ جب یہاں پہنچتیں تو یا تو ایک لمبی

لائن پہلے سے موجود ہوتی یا چشمے کے منہ سے ایک ایسی پتلی سی دھار کو نکلتے دیکھتیں جو آدھے گھنٹے میں مشکل سے ایک گھڑا بھرتی تھی - اور تین کوس کا آنا جانا قیامت سے کم نہ تھا - لڑائی کی وجہ کچھ بھی ہو اصلی لڑائی پانی کی تھی - دونوں عورتوں نے دیکھتے دیکھتے ایک دوسرے کے چہرے نوچ لیے ، گھڑے توڑ دیے ، کپڑے پھاڑ ڈالے اور پھر روتی ہوئی اپنے اپنے گھروں کو گئیں - تب سیداں نے سرور خاں کو بھڑکایا اور عائشاں نے ایوب خاں کو - دونوں خاوند غصے سے بے تاب ہو کے کلہاڑیاں لے کے باہر نکل پڑے اور پیشتر اس کے کہ لوگ آ کے بیچ بچاؤ کریں دونوں نے کلہاڑیوں سے ایک دوسرے کو ختم کر دیا - شام ہوتے ہوتے دونوں ہمسایوں کا جنازہ نکل گیا - ہمارے گاؤں کے قبرستان کی بہت سی قبریں پانی نے بنائی ہیں -

میرے لڑکپن کے زمانے میں جب یہ دو قتل ہوئے اس وقت سامنے کے پہاڑ پر ہی ایک میٹھے پانی کا چشمہ تھا لیکن بعد میں جب میں اور بڑا ہؤا تو یہاں ایک اور چشمہ بھی نکل آیا - اس نئے چشمے کی داستان بھی بڑی عجیب ہے - یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہمارے پوٹھوہار میں سخت کال پڑا تھا اور گرمی کی وجہ سے علاقے کے سارے ندی نالے اور کنوئیں سوکھ گئے تھے - صرف کہیں کہیں ان چشموں میں پانی رہ گیا تھا جو پہاڑوں کی کھوؤں میں تھے ، جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہ تھا - ان دنوں ہمارے گھروں میں عورتیں رات کے دو بجے ہی اٹھ کے چل دیتیں اور چشمے کے نیچے ہمیشہ گھڑوں کی ایک لمبی قطار دکھائی دیتی — ایک لمبی پیاسی خالی گھڑوں کی قطار ، جس میں سے پیاس سے

بلکتے ہوئے بچوں کی صدا آتی تھی -

اس زمانے میں بڑے بڑے لوگ نیکی اور خدائی سے منحرف ہو گئے اور ان لوگوں میں سب سے بُرا کام ذیلدار ملک خان نے کیا - اس نے تھانیدار فضل علی سے مل کے اس چشمے پر پولیس کا پہرہ لگا دیا اور پھر تحصیل دار غلام نبی سے مل کے چشمے کے اردگرد کی ساری زمین خرید کر راتوں رات اس پر ایک چار دیواری باندھ دی اور چار دیواری کے باہر تالا لگا دیا - اب اس چشمے سے کوئی آدمی بلا اجازت پانی نہ لے سکتا تھا کیونکہ اب یہ چشمہ ذیلدار کی ملکیت تھا ، اور ذیلدار نے چشمے سے پانی لے جانے والے گھڑوں پر اپنا ٹیکس رکھ دیا : ایک گھڑے پر ایک آنہ ، دو گھڑوں پر دو آنے -

تب سارے گاؤں میں اس ظلم کے خلاف شور مچ گیا - لیکن پولیس اور سرکار ذیلدار ملک خان کی حمایت میں تھی ، قانون بھی اس کی طرف تھا - اور جدھر قانون تھا پانی بھی آدھر تھا اس لیے گاؤں کے سارے جوان اور بڈھے اور بچے جمع ہو کے میرے ابا کے پاس آئے اور بولے: " چچا خدا بخش اب تم ھی ھمیں اس مصیبت سے نجات دلوا سکتے ہو -"

" وہ کیسے ؟ " میرے ابا نے حیران ہو کے پوچھا -

سفید ریش بڈھے حاکم خاں نے کہا : " یاد ہے یہ میٹھے پانی کا چشمہ ، جو اب ذیلدار ملک خاں کا ہو گیا ، یہ چشمہ بھی تم نے دریافت کیا تھا - کیا تم دوسرا چشمہ نہیں ڈھونڈھ سکتے؟ آخر اس پہاڑ کے اندر ، اس کے سینے میں اور بھی تو کہیں میٹھا پانی ہوگا جو انسان کو آبِ حیات بخش سکتا ہے - خدا بخش

تم ہم سب سے قابل ہو۔ اپنی عقل دوڑاؤ ، ہم تمھارے ساتھ مارنے مرنے کو تیار ہیں ۔ ہمارے گاؤں میں پانی نہیں ہے اور اب پانی چاہیے ۔''

میرا ابا چارپائی پر اکڑوں بیٹھا تھا ۔ اسی وقت اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑا ہؤا۔ سارا گاؤں اس کے ساتھ تھا ۔ پہاڑ پر چڑھائی تھی اور تلاش پانی کی تھی ۔ فرہاد کی کوہ کنی سے پانی کی تلاش مشکل ہے ، یہ بات مجھے اس روز معلوم ہوئی کیونکہ پانی سامنے نہیں ہوتا وہ تو ایک چھلاوے کی طرح پہاڑ کی سلوٹوں میں گم ہو جاتا ہے ۔ پانی خانہ بدوش ہے : آج یہاں ، کل وہاں ۔ پانی ایک پردیسی ہے جس کی محبت کا کوئی اعتبار نہیں ۔ پانی کا وجود اس نازک خوشبو کی طرح ہے جو تیز دھوپ میں اڑ جاتی ہے ۔ اس پوٹھوہار کے علاقے میں ، جہاں عورتیں با وفا اور با حیا ہیں ، پانی بے وفا اور ہرجائی ہے ۔ وہ کبھی کسی ایک کا ہو کے نہیں رہتا ، کبھی ایک ٹھکانے پر نہیں ملتا ، کسی ایک چشمے میں نہیں رہتا ۔ وہ ہمیشہ یہاں سے وہاں ، ایک جگہ سے دوسری جگہ ، ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا ہے ، پاسپورٹ کے بغیر ۔ ایسے ہر جائی کی تلاش کے لیے ایک تیشہ نہیں ایک ایسا آئینہ چاہیے جس کے سامنے پہاڑ کا دل اس طرح ہو جیسے ایک کھلی کتاب ۔ آخر میرے گاؤں والوں نے کچھ سمجھ کر میرے باپ کو اس کام کے لیے چنا تھا ۔

اس روز ہم دن بھر اس بلند و بالا پہاڑ کی خاک چھانتے رہے ۔ ہم نے کہاں کہاں اس پانی کو تلاش نہیں کیا ! بیریوں کی گھنی جھاڑیوں میں ، چٹانوں کی گہری درزوں میں ، سیاہ ڈراؤنی

کھوؤوں میں ، جنگلی جانوروں کے بھٹ میں - پانی کی تلاش میں ہم نے سارے پرانے چشمے کھود ڈالے لیکن ان کا کھودنا ایسے ہی تھا جیسے آدمی زندگی کی تلاش میں قبریں کھود ڈالے - پانی کہیں نہیں ملا - ایک چور کی طرح اس نے جگہ جگہ اپنے جھوٹے سراغ چھوڑے لیکن آخر کو وہ ہمیشہ ہمیں جُل دے کر کہیں غائب ہو جاتا تھا - جانے فطرت کے کس کونے کے اندر کس مقام پر وہ کس گہرے غار میں بیٹھا ہؤا اپنے چاہنے والوں پر ہنس رہا تھا -

لیکن گاؤں والوں نے آس نہیں چھوڑی - وہ سارا دن میرے ابا کے پیچھے پیچھے پانی کی کھوج کرتے رہے - آخر جب شام ہونے کو آئی تو میرے ابا نے پسینہ پونچھ کر ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کے ادھر نظر دوڑائی جدھر سورج غروب ہو رہا تھا - یکایک انہیں غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چٹانوں کی ایک گہری درز میں فرن کا سبزہ نظر آیا - اور کہتے ہیں جہاں فرن کا سبزہ ہوتا ہے وہاں پانی ضرور ہوتا ہے - فرن پانی کا جھنڈا ہے اور پانی ایک گھومنے والی قوم ہے - پانی جہاں جاتا ہے اپنا جھنڈا ساتھ لے جاتا ہے -

ایک چیخ مار کے جلدی سے میرے ابا اس طرف لپکے جہاں فرن کا سبزہ اُگا تھا - گاؤں والے ان کے پیچھے پیچھے بھاگے - جلدی جلدی میں میرے ابا نے اپنے ناخنوں ہی سے زمین کو کریدنا شروع کر دیا - زمین، جو اوپر سے سخت تھی، نرم ہوتی گئی ، گیلی ہوتی گئی - آخر میں زور سے پانی کی ایک دھار اوپر آئی اور سینکڑوں سوکھے ہوئے گلوں سے مسرت کی آواز نکلی :

" پانی ! پانی ! "

ابا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اوک میں پانی بھرا ۔ ساری نگاہیں ابا کے چہرے پر تھیں ، سینکڑوں دل دھڑک رہے تھے: یا اللہ پانی میٹھا ہو ، یا اللہ پانی میٹھا ہو ۔

ابا نے پانی چکھا ۔ "پانی میٹھا ہے ۔" ابا نے خوشی سے کہا ۔

گاؤں والے زور سے چلائے : " پانی میٹھا ہے ! "

ساری وادی میں آوازیں گونج اٹھیں : " پانی میٹھا ہے ، پانی مل گیا ، پانی میٹھا ہے ! "

ساری وادی میں ڈھول بجنے لگے ۔ عورتیں گانے لگیں ، جوان ناچنے لگے ، بچے شور مچانے لگے ۔ گاؤں والوں نے جلدی سے چشمے کو کھود کر اپنے گھیرے میں لے لیا ۔ اب چشمہ ان کے بیچ میں تھا اور وہ اس کے چاروں طرف تھے اور وہ اسے مڑ مڑ کر اس طرح محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے جیسے ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہے ۔

وہ رات مجھے کبھی نہیں بھولے گی ۔ اس رات کوئی آدمی گاؤں میں واپس نہیں گیا ۔ اس رات سارے گاؤں نے چشمے کے کنارے جشن منایا ۔ اس رات تاروں کی گود میں بھومی بیریوں کے سائے میں ماؤں نے چولہے سلگائے ، بچوں کو تھپک تھپک کر سلایا ۔ اس رات کنواریوں نے لہک لہک کر گیت گائے ۔ ایسے گیت جو پانی کی طرح نرمل اور سندر تھے ، جن میں جنگلی جھرنوں کا سا حسن اور آبشاروں کی سی روانی تھی ۔ اس رات ساری عورتیں حسین تھیں اور ساری زمین زرخیز تھی اور ساری جڑیں ہری تھیں اور سارے بیج تخلیق سے بے قرار ہو کر پھوٹ پڑے تھے ۔

ایسی رات ہمارے گاؤں میں کب آئی تھی ! جب ابا خدا بخش نے پانی ڈھونڈ نکالا تھا ۔ پانی ، جو انسان کے ہاتھوں کی محنت تھا ، اس کے دل کی محبت تھا ۔ آج پانی ہمارے ہاں اس طرح آیا تھا جیسے بارات ڈولی لے کے آتی ہے ۔ وہ نیا چشمہ ہمارے درمیان آج اس طرح ہولے ہولے شرمیلے انداز میں چل رہا تھا جیسے نئی دلہن جھجک جھجک کر اجنبی آنگن میں پاؤں رکھتی ہے ۔ اس رات میرے ایک ہاتھ میں پانی تھا ، دوسرے ہاتھ میں بانو کا ہاتھ تھا اور آسمان پر ستارے تھے ۔

اس نئے چشمے کے ساتھ میری جوانی کی بہترین یادیں وابستہ ہیں ۔ اس چشمے کے کنارے میں نے بانو سے محبت کی ۔ بانو ، جس کا حسن پانی کی طرح نایاب تھا ، جسے دیکھ کر ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ جانے اس زمین کی گود میں کتنے ہی میٹھے چشمے نہاں ہیں ، کتنی حسین یادیں منجمد ہیں ؛ موسم گرما کے کتنے ہی شوخ چمکتے ہوئے پھول ، خزاؤں کے سنہری پتے ، زمستان کی پاکیزہ برف ۔ بانو کی محبت بھی کتنی خاموش اور چپ چاپ تھی ، زمین کے نیچے بہنے والے پانی کی طرح ۔ وہ رات کے اندھیرے میں یا فجر سے بہت پہلے اس چشمے کے کنارے آتی تھی ، جب یہاں اور کوئی نہ ہوتا میرے سوا ۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر تبسم کی ضیا پھیل جاتی ، جیسے اندھیرے میں سحر کا اجالا پھیلتا ہے ۔ وہ گھڑے کو چشمے کی دھار کے نیچے رکھ دیتی ۔ پانی گھڑے سے باتیں کرنے لگتا اور میں بانو سے ۔ دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوتے گھڑا بھر جاتا اور ہمارے دل خوشی سے معمور ہو جاتے اور ہمارے جانے بغیر

کہیں دور سے صبح یوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آتی جیسے بادِ نسیم سنگترے کے پھولوں کی سی انگلیاں لیے سوئے ہوئے چہروں پر سے گزر جاتی ہے اور ہم چونک کر اٹھ کھڑے ہوتے اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ پھر میں اس کا گھڑا اٹھا کر اس کے سر کے اوپر رکھی ہوئی سرخ پٹی پر رکھتا اور وہ مسکرا کر ، پلٹ کر اور گھوم کر ڈھلوان پر سے گزر جاتی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہتا ۔ اس وقت بھی دیکھتا رہتا جب دوسری عورتیں میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگتیں ، اور مجھے وہ دن یاد آتا جب میں نے دادی اماں سے پوچھا تھا : " دادی اماں عاشق کسے کہتے ہیں ؟ "

اور پھر اس چشمے کے کنارے مجھے وہ رات بھی یاد ہے جب میں کان میں کام کرتا تھا اور دن بھر تھک کے گھر لوٹتا تھا اور اس تھکن سے چور ہو کر سو جاتا تھا ۔ صبح ہی آنکھ کھلتی تھی ۔ کئی دنوں سے میں بانو سے چشمے پر ملنے نہ گیا تھا مگر کوئی بے قراری نہ تھی ۔ وہ ساتھ کے گھر میں تو رہتی تھی ۔ انھی دنوں میں اس کے چچا کا لڑکا غضنفر بھی آیا اور چلا بھی گیا لیکن مجھے اس سے ملنے کی بھی فرصت نہ ملی کیونکہ کان میں نیا نیا ملازم ہؤا تھا ، کام سیکھنے کا بہت شوق تھا اور یہ تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ نمک کی کان میں جا کے ہر شخص نمک ہو جاتا ہے ۔

ایک رات بانو نے مجھے کہا کہ میں رات کے دو بجے چشمے پر اس سے ملوں ۔ میں نے کہا : " میں بہت تھکا ہؤا ہوں ۔" وہ بولی : " نہیں ضروری کام ہے ، آنا ہو گا ۔" چنانچہ میں گیا ۔

دو بجے کے وقت آدھی رات میں چشمے پر کوئی نہیں تھا ، ہم دونوں کے سوا ۔ میں نے اس سے پوچھا : " کیا بات ہے ؟ " وہ دیر تک چپ رہی ، پھر میں نے پوچھا : " بھئی بتاؤ ، آخر کیا بات ہے ؟ "

وہ بولی : " میں گاؤں چھوڑ کر جا رہی ہوں ۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا ۔ مجھے ایسا محسوس ہؤا جیسے چشمہ چلتا چلتا رک گیا ۔ میرے گلے سے آواز نکلی : " کیوں ؟"

" میری شادی طے ہو گئی ہے ۔"

" کس سے ؟ "

" چاچا کے لڑکے کے ساتھ ، جو لام سے ہو کے یہاں آیا تھا ۔ وہ چکوال میں ہے ، صوبیدار ہے ۔"

" اور تم جا رہی ہو ! " میں نے تلخی سے پوچھا ۔

" ہاں ۔"

وہ چپ ہو گئی ، میں بھی چپ ہو گیا ۔ سوچ رہا تھا اسے ابھی جان سے مار دوں یا شادی کی رات قتل کروں ۔ تھوڑی دیر رک کے بانو پھر بولی : " سنا ہے چکوال میں پانی بہت ہوتا ہے ۔ سنا ہے وہاں بڑے بڑے نل ہوتے ہیں جن سے جب چاہو ٹوٹی گھما کے پانی نکال لو ۔"

اس کی آواز خوشی کے مارے کانپ رہی تھی ۔ وہ شاید اور بھی کچھ کہتی لیکن شاید میری آزردگی کا خیال کر کے چپ ہو گئی ۔

میں نے اس کے بالکل قریب آ کر اسے دونوں شانوں سے پکڑ لیا اور غور سے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا ۔ اس نے

ایک لمحہ میری طرف دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں ۔ اس کی نگاہوں میں میری محبت سے انکار نہیں تھا بلکہ پانی کا اقرار تھا ۔ میں نے آہستہ سے اس کے شانے چھوڑ دیے اور الگ ہو کے کھڑا ہو گیا ۔ یکایک مجھے محسوس ہؤا کہ محبت سچائی ، خلوص اور جذبے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا پانی بھی مانگتی ہے ۔ بانو کی جھکی ہوئی نگاہوں میں اک ایسی جانگسل شکایت کا گریز تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو : جانتے ہو ہمارے گاؤں میں کہیں پانی نہیں ملتا ۔ یہاں میں دو دو مہینے نہا نہیں سکتی ۔ مجھے اپنے آپ سے ، اپنے جسم سے نفرت سی ہو گئی ہے ۔

بانو چپ چاپ زمین پر چشمے کے کنارے بیٹھ گئی ۔ میں اس تاریکی میں بھی اس کی آنکھوں کے اندر اس محبت کے خواب کو دیکھ سکتا تھا جو گندے بد بودار جسموں ، پسوؤں جوؤں اور کھٹمل کی ساری غلیظ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی محبت نہ تھی ؛ اس محبت سے نہائے ہوئے جسموں ، دھلے ہوئے کپڑوں اور نئے لباس کی مہک آتی تھی ۔

میں بالکل مجبور اور بے بس ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا ۔

رات کے دو بجے ۔ بانو اور میں ۔ دونوں چپ چاپ ۔

کبھی ایسا سناٹا جیسے ساری دنیا خالی ہے ، کبھی ایسی خاموشی جیسے سارے آنسو سو گئے ہیں ۔

چشمے کے کنارے بیٹھی ہوئی بانو آہستہ آہستہ گھڑے میں پانی بھرتی رہی ۔ آہستہ آہستہ پانی گھڑے میں گرتا ہؤا بانو سے باتیں کرتا رہا ، اس سے کچھ کہتا رہا ، مجھ سے کچھ کہتا رہا ۔ پانی کی باتیں انسان کی بہترین باتیں ہیں ۔

بانو چلی گئی -

جب بانو چلی گئی تو میرے ذہن میں بچپن کی وہ کہانی آئی جب محبت روئی تھی اور آنسو نمک کے ڈلے بن گئے تھے- اس وقت میری آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ تھا ، لیکن میرے دل کے اندر نمک کے کتنے بڑے ڈلے اکٹھے ہوگئے تھے! میرے دل کے اندر نمک کی ایک پوری کان موجود تھی - نمک کی دیواریں ، ستون ، غار اور کھارے پانی کی ایک پوری جھیل - میرے دل اور دماغ اور احساسات پر نمک کی ایک پتلی سی جھلی چڑھ گئی تھی اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اگر میں اپنے جسم کو کہیں سے بھی کھرچوں گا تو آنسو ڈھلک کر بہہ نکلیں گے اس لیے میں چپ چاپ بیٹھا رہا اور جب وہ میری طرف دیکھ کر ڈھلوان پر مڑ گئی اس وقت بھی میں چپ چاپ بیٹھا رہا کیونکہ میرے پاس پانی نہیں تھا اور بانو پانی کے پاس جا رہی تھی -

جس رات بانو کا بیاہ غضنفر سے ہؤا اس رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا - میں نے دیکھا کہ ہماری کھوئی ہوئی ندی ہمیں واپس مل گئی ہے اور نمک کے پہاڑ پر میٹھے پانی کے چشمے ابل رہے ہیں اور ہمارے گاؤں کے مرکز میں ایک بہت بڑا درخت کھڑا ہے - یہ درخت سارے کا سارا پانی کا ہے - اس کی جڑیں ، شاخیں ، پھل ، پھول پتیاں سب پانی کی ہیں اور اس درخت کی شاخوں سے ، پتوں سے پانی بہہ رہا ہے اور یہ پانی ہمارے گاؤں کی بنجر زمین کو سیراب کر رہا ہے -

اور میں نے دیکھا کہ کسان ہل جوت رہے ہیں ، عورتیں کپڑے دھو رہی ہیں ، کان کن نہا رہے ہیں اور بچے پھولوں

کے ہار لیے پانی کے درخت کے گرد ناچ رہے ہیں اور بانو صاف ستھرے کپڑے پہنے میرے کندھے سے لگی مجھ سے کہہ رہی ہے:
" اب ہمارے گاؤں میں پانی کا درخت آگ آیا ہے ۔ اب میں تمھیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی ۔"

یہ بڑا عجیب خواب تھا لیکن میں نے جب اپنے ابا کو سنایا تو وہ مارے ڈر کے کانپنے لگے، بولے: " تم نے یہ خواب میرے سوا کسی دوسرے کو تو نہیں سنایا ۔"

میں نے کہا: " نہیں ابا ، مگر آپ ڈر کیوں گئے ہیں؟ یہ تو ایک خواب ہے ۔"

وہ بولے: " ارے خواب تو ہے ، مگر یہ ایک سرخ خواب ہے ۔"

میں نے ہنس کر کہا: " نہیں ابا ، جو درخت میں نے خواب میں دیکھا وہ سرخ نہیں تھا ۔ اس کا رنگ تو بالکل ایسا تھا جیسے پانی کا ہوتا ہے ۔ وہ پانی کا درخت تھا ۔ اس کا تنا ، شاخیں ، پتے سب پانی کے تھے ۔ ہاں اس درخت پر پھلوں کی جگہ کٹ گلاس کی چمکتی ہوئی صراحیاں لٹکی تھیں اور ان میں پانی بچوں کی ہنسی کی طرح چمکتا تھا اور فواروں کی طرح اونچا جا کے گرتا تھا ۔"

وہ بولے: " کچھ بھی ہو یہ بڑا خطرناک سپنا ہے ۔ اگر پولیس نے کہیں سن لیا یا تم نے کسی سے اس کا ذکر کر دیا تو وہ تمھیں اس طرح پکڑ کے لے جائیں گے جس طرح وہ ان مزدوروں کو پکڑ کے لے گئے تھے جنھوں نے ہمارے گاؤں کی ندی کو واپس لانا چاہا تھا ۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اس

خواب کا ذکر کسی سے نہ کرو ۔ اسے بھول جاؤ جیسے تم نے یہ خواب کبھی نہ دیکھا تھا ۔ کیونکہ اس خواب کا چرچا کرنے سے کچھ نہ ہو گا ، سوکھی ندی ہمیشہ سوکھی رہے گی اور پیاسے سدا پیاسے رہیں گے ۔"

مجھے اپنے ابا کے لہجے کی حسرت ناکی آج تک یاد ہے ۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ شروع شروع میں اس کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا ۔ لیکن جب چند دن گزر گئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے کان کے چند مزدور ساتھیوں سے اپنے خواب کا ذکر کیا تو وہ میرا خواب سن کر ڈرنے کی بجائے ہنسنے لگے اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے تو انھوں نے کہا : " بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ۔ یہ خواب تو بہت اچھا ہے اور یہاں کان میں ہر ایک دیکھ چکا ہے ۔"

" کیا سچ کہتے ہو ! وہی پانی کا درخت ؟ "

" ہاں ، ہاں ۔ وہی پانی کا درخت گاؤں میں ، ایک ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ ہر نمک کی کان میں ! "

" گھبراؤ نہیں ، ایک دن یہ خواب ضرور پورا ہو گا ۔"

پہلے مجھے ان کی باتوں کا یقین نہیں آیا لیکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام کرتے کرتے اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ہمارا خواب ضرور پورا ہو گا ۔ ایک دن ہمارے گاؤں میں پانی کا درخت ضرور اگے گا اور جو جام خالی ہیں وہ بھر جائیں گے اور جو کپڑے میلے ہیں وہ دھل جائیں گے اور جو دل ترسے ہوئے ہیں وہ کھل جائیں گے اور ساری زمینیں اور ساری محبتیں اور سارے ویرانے اور سارے صحرا شاداب ہو جائیں گے ۔

سالگرہ

میرے بچے کی پانچویں سالگرہ تھی۔

ماں نے اسے نئے کپڑے پہنائے، دوستوں نے تحفے پیش کیے۔ دوسرے گھروں سے اور بھی بچے آئے تھے۔ میرا بچہ دن بھر ان سے کھیلتا رہا، آم کھا کر اپنے کپڑے میلے کرتا رہا، جامن چیکو کے درختوں پر چڑھنے کی کوشش کرتا رہا اور جب اس کے سارے دوست چلے گئے اور وہ بالکل تھک گیا تو سونے کے لیے میری گود میں آ بیٹھا۔

بچے نے پوچھا: "آج ماں نے ہمیں دن بھر پیار کیا۔ ایک بار بھی نہیں ڈانٹا۔ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا: "آج تمھاری سالگرہ ہے۔"

وہ بولا: "تو پھر یہ سالگرہ ہر روز کیوں نہیں ہوتی؟"

میں نے کہا: "ہر روز کیسے ہو گی۔ تمھاری زندگی کا پانچواں سال ہے۔"

بچہ چپ ہوگیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولا: "آج نیا سال آیا ہے تو، تو پھر میرا پچھلا سال کدھر گیا؟"

سوال اتنا عجیب تھا کہ میں بالکل چکرا گیا۔ میں نے اپنی اور اپنے دوستوں کی اتنی سالگرہیں منائیں لیکن کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ پچھلا سال کہاں جاتا ہے۔ نئے سال کی خوشی میں پچھلے

سال کی یاد کسے آتی ہے - نئے دوست کے ملنے پر کون پرانے دوستوں کو یاد کرتا ہے - یہ تو دنیا کا دستور ہے -

لیکن بچوں کا دستور دوسرا ہوتا ہے -

اس لیے بچے نے پھر مجھ سے پوچھا : " بتاؤ نا پچھلا سال کہاں گیا ؟ "

میں کیا بتاتا اسے ! پانچ سال کے ننھے کو وقت کی گردش سمجھاتا ! اس لیے میں نے خود ہی اس سے پوچھ لیا ، کیونکہ جب میں اپنے بچے کے کسی سوال کو خود نہ بتا سکوں تو خود اس سے ہی پوچھ لیا کرتا ہوں :

" تم خود بتاؤ ننھے پچھلا سال کہاں گیا ؟ "

ننھے کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی - وہ بہت دیر تک مسکراتا رہا ، آپ ہی آپ - میں نے دیکھا اس کی پلکوں پر نیند جھکی ہوئی ہے اور وہ کہیں بہت دور دیکھ رہا ہے -

تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا : " دیکھو وہ جامن کا پیڑ ہے نا جو ناریل کے درخت کے پاس -"

" ہاں -"

" وہ کنوئیں والا ناریل نہیں ، آم کے پیڑ کے پاس جو ناریل کا درخت ہے -"

" ہاں -"

" بس اس جامن کے درخت کے اوپر چڑھتے جاؤ -"

" ہاں -"

" اوپر ہی اوپر اور اوپر -"

" ہاں -"

" اور اوپر جہاں آسمان ہے نا وہاں تک جامن کا پیڑ جاتا ہے ۔"

" اچھا ۔"

" ہاں ، اس کے اوپر پچھلا سال رہتا ہے ۔"

" ارے واہ ۔ یہ تو نئی بات سنائی تم نے ! تم کیا جامن کے پیڑ پر چڑھے تھے ؟"

بچے نے بڑی اداسی سے کہا : " نہیں ، پیڑ بہت اونچا ہے میں چڑھ نہیں سکا ، مگر میں جانتا ہوں وہ وہیں پر ہو گا ۔ اونچا ، اونچا اور اونچا ، سب سے اونچی جگہ پر ۔"

پھر بچے کی پلکیں جھک گئیں اور وہ میری گود میں سو گیا اور میں اپنے سوئے ہوئے بچے کو اپنی گود میں لیے لیے سو گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے کسی نے کندھے سے ہلا کر جگایا ۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا : ایک آدمی خوشنما لباس پہنے ، سر پر ہیروں کا تاج رکھے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔

میں نے پوچھا : " تم کون ہو ؟ "

وہ بولا : " یاد کرو ، اتنی جلدی بھول گئے ؟ "

میں نے کہا : " میں نے تم کو کبھی نہیں دیکھا بھائی ۔"

وہ بولا : " میں تمھارا چوتھا سال ہوں ۔"

میں جلدی سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا ۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ پکڑتے ہی مجھے ایسا محسوس ہؤا جیسے میرے چاروں طرف گھرا جنگل ہے ، چیل اور دیودار کے درخت ہوا کے جھونکوں سے سائیں سائیں کر رہے ہیں اور میں ایک سبز اور پیلے رنگ والی تیتری کا پیچھا کرتے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے

ہاتھ پاؤں ہلاتا ہؤا تیزی سے ایک طرف بھاگ رہا ہوں ۔

تیتری موڑ پر سے کہیں غائب ہو گئی ۔

میں موڑ سے گزر کر اس کی طرف بھاگا ۔ اب تیتری میرے بالکل قریب تھی ۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر جھپٹا مارا مگر تیتری آگے اُڑتی چلی گئی اور ایک جھاڑی کے نیلے نیلے پھولوں پر ڈولنے لگی ۔ پھر وہ اس کے پتوں میں چھپ گئی ۔ اس کے پروں کا سبز رنگ پتوں سے مل گیا ، مگر اس کی پیلی دھاریاں کیسے مجھ سے چھپتیں ؟ میں نے آہستہ سے ہولے ہولے گھٹنوں کے بل چل کے عین اس وقت ، جب تیتری ایک نیلے پھول کو سونگھ رہی تھی ، اپنا رومال اس پر رکھ دیا اور پھر اسے قید کر کے اپنی مٹھی کے خول میں رکھ لیا ۔

تیتری کے پر ڈر کے مارے کانپنے لگے اور میں نے دیکھا کہ جنگل کے سارے درخت ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں ، تنے سے تنے ملتے جا رہے ہیں اور تنوں کے پیچھے خوفناک آنکھیں — سبز اور سیاہ اور سرخ رنگ کی آنکھیں — چمک رہی ہیں اور میں ڈر کے مارے کانپ گیا ۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور اپنے چاروں طرف سیاہ جنگل کو پایا ۔ اب مجھے معلوم ہؤا کہ تیتری کے پیچھے بھاگتے ہوئے چلا تو میں اپنے باغ سے تھا لیکن بھاگتے بھاگتے جنگل میں آ گیا ۔ میں نے چلا کے کہا :

" ماں ! ماں ! "

جنگل کے درختوں نے ہنس کے کہا : " ھا ھا ھا ! "

" ماں ، ماں ، ماں ! " میں اور بھی زور سے چلایا ۔

" ھا ھا ھا ھا ! " جنگل کے درخت اور بھی زور سے ہنسنے

لگے ۔

"چاھے تم کتنے بھی زور سے ھنسو"، میں نے غصے میں درختوں سے کہا ، " ھم خود اپنا راستہ ڈھونڈ لیں گے ۔"

لیکن درخت بالکل ایک دوسرے کے قریب آ گئے ۔ تنے سے تنے لگ گئے، جھکی ھوئی ڈالیاں چھڑیاں بن گئیں اور راستہ تنگ سے تنگ اور چھوٹے سے چھوٹا ھوتا گیا ۔ آخر کار ایک جگہ بنفشے کے پھولوں کی ایک بہت بڑی باڑ نظر آئی ۔ یہاں آ کر راستہ بالکل بند ھو گیا ۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا ، زمین سے آسمان تک بنفشے کے پھولوں کی دیوار تھی ۔

" ماں ماں ۔"

پھول زور زور سے کھلکھلا کے ھنسنے لگے ۔

اتنے میں ایک بڑی خوبصورت پری آئی ۔ اس کا لباس ایسا تھا جیسے بنفشے کے پھولوں سے تیار کیا گیا ھو ۔ اس کے دائیں ھاتھ میں نیلے پھولوں کی ایک چھڑی تھی جس کے سرے پر بنفشے کا ایک پھول تھا جو بالکل لال رنگ کے یاقوت کی طرح چمکتا تھا ۔ اس نے آ کر میرے کندھے پر ھاتھ رکھ دیا اور بولی : " بچے تم کیوں رو رھے ھو ؟ "

میں نے کہا : " میں ماں کے پاس جانا چاھتا ھوں ۔"

پری بولی : " تمھاری ماں کہاں ھے ؟ "

" وہ جنگل کے اس پار ھے ۔"

وہ بولی : " تو چلے چلو ، تمھیں کون روکتا ھے ۔"

میں نے کہا : " اِدھر دیوار ھے اُدھر درخت راستہ نہیں

دیتے ۔ آوں آوں آوں ۔"

" اس نے میرے ہاتھ میں تیتری کو دیکھ لیا ، بولی :

" یہ کیا ہے ؟ "

میں نے کہا : "اوھو ، اسے مت چھووؤ یہ میری تیتری ہے ۔"

" تم اسے لے کر کیا کرو گے ؟ "

میں نے کہا : " میں اس کے پر آتار کر اپنی تصویروں والی کتاب میں رکھوں گا ۔"

وہ بولی : " پر آتارو گے تو یہ مر جائے گی ۔"

" مر جائے ۔"

وہ بولی : "تو پھر اس کی ماں روئے گی ۔"

میں نے پوچھا : " اس کی ماں روئے گی ؟ "

" ہاں ۔"

میں نے پوچھا : " اس کی ماں کون ہے ؟ "

پری تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولی : " میں اس کی ماں ہوں ۔"

میں دیر تک چپ رہا ۔ تیتری کے پر بڑے خوبصورت تھے ، میں نے اسے بڑی مشکل سے پکڑا تھا لیکن پری کی نیلی آنکھوں میں آنسو تھے ، جیسے کبھی کبھی میری ماں کی آنکھوں میں ہوتے ہیں ۔ میں نے چپکے سے تیتری پری کی گود میں ڈال دی اور اپنا سر جھکا دیا ۔

پری مسکرانے لگی اور پھر میں نے دیکھا وہ تیتری ایک چھوٹی سی پری بن گئی جس کا لباس سبز رنگ کا تھا ، گال پیلے تھے پیلے ۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے کہنے لگی : " تم مجھے بڑے

اچھے لگتے ہو ۔ میں تو تم سے کھیلنا چاہتی تھی لیکن تم تو مجھے جان سے مار رہے تھے ۔"

میں نے کہا : " اب تمھیں کچھ نہیں کہوں گا ۔ تم میرے باغ میں آ کے مجھ سے کھیلا کرنا ۔ مجھے معلوم نہیں تھا تم پری ہو ۔"

پری کی ماں نے کہا : " بیٹا سب تیتریاں پریاں ہی ہوتی ہیں جو بچوں سے کھیلنے کے لیے گاؤں اور باغوں میں جاتی ہیں ۔"

" اچھا ! "

" ہاں ۔ آؤ اب تمھیں گھر کا راستہ بتاؤں ، نہیں تو تمھاری ماں روتے روتے مر جائے گی ۔"

پھر پری نے پھولوں کی چھڑی سے اشارہ کیا اور تنوں سے تنے الگ ہوتے گئے ، ڈالوں کی چھتریاں اونچی ہوتی گئیں اور آسمان نظر آ گیا اور پھر جنگل کا کنارہ بھی آ گیا اور میں نے دیکھا کہ میری ماں اور میرا باپ دو نوکر ساتھ لیے مجھے ڈھونڈ رہے ہیں اور ماں بار بار پلو سے اپنے آنسو پونچھتی جاتی ہے ۔

میں نے چلا کے کہا : " ماں میں یہاں ہوں ۔ یہ دیکھو میرے ساتھ ایک پری بھی ہے ۔"

میں نے مڑ کر دیکھا دونوں پریاں غائب تھیں ۔ ہاں دور جنگل کی طرف ایک بنفشی رنگ کی تیتری کے ساتھ ایک سبز اور نیلے رنگ کی تیتری بھاگی جا رہی تھی ۔

یکایک خوشنما لباس اور ہیروں کا تاج پہنے ہوئے آدمی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میری نظروں سے دور جنگل میں غائب ہو گیا ۔ اس آدمی کے چہرے پر ایک جگمگ جگمگ کرتی

مسکراہٹ آئی اور اس نے مجھ سے پوچھا : " یاد ہے ۔"

میں نے مسکرا کر کہا : "ہاں یاد ہے تم میرا چوتھا سال ہو ۔ مگر تم کہاں چلے گئے تھے ۔"

وہ مجھ سے اور دور ہو گیا ، بولا : " سات سمندر پار ایک جزیرہ ہے ۔ اسے یادوں کا جزیرہ کہتے ہیں ۔ میں وہاں رہتا ہوں ۔ طوفانی لہروں پر بچے کبھی کبھی کاغذ کی کشتی کھیتے ہوئے آ جاتے ہیں تو بڑی چہل پہل ہوتی ہے ورنہ وہاں ہر وقت نیند چھائی رہتی ہے ۔"

میں نے کہا : " مگر میرا بچہ تو کہتا ہے کہ تم جامن کے پیڑ کے اوپر رہتے ہو ۔"

وہ بولا : " کبھی جامن کے پیڑ کے اوپر اور کبھی املی کے درخت کے نیچے ، کبھی کھیت کے کنارے ، کبھی کسی گلی کی نکڑ پر ، جہاں جہاں بچے ہمیں بلاتے ہیں ہم پہنچ جاتے ہیں ، اپنے خوابوں کے جزیرے سے نکل کر ، کیونکہ وہ بچے ہیں بڑے نہیں ہیں ۔ بڑوں کے لیے تو پرانا سال مر جاتا ہے اور نیا سال جنم لیتا ہے ، لیکن بچے ہمیں ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں ۔ تمھیں یہ سن کر بڑی حیرت ہو گی کہ آج سے دو ہزار برس بلکہ پانچ ہزار برس پرانا سال بھی زندہ ہے ، جس طرح وہ زندگی کے پہلے روز تھا ۔ جس دن اس نے کسی بچے سے اپنا ہاتھ ملایا تھا ؛ وہ تو ایک لمحے کے لیے بڈھا نہیں ہوا ۔

آدمی مر جاتے ہیں لیکن سال ہمیشہ زندہ رہتے ہیں ۔

وہ اتنی بات کہتے کہتے مجھ سے دور ہوتا گیا ۔ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کے باغ میں چلا گیا اور اپنے چاروں طرف دھیمی

دھیمی ، مدھم مدھم جگنوؤں کی روشنی پھیلاتا گیا ۔

میں نے چلا کر اس سے کہا : " سنو ، ایک بات بتاؤ ۔ وہ سبز اور پیلے رنگوں والی پری اب کہاں ہے ؟ "

وہ ہنسا اور جامن کے درخت کے اوپر چڑھتا گیا ، ہنستا گیا اور چڑھتا گیا ۔ اونچا ، اونچا اور اونچا ۔ جامن کا پیڑ آسمان سے جا لگا اور وہ آسمان کی چھت میں غائب ہو گیا ۔

یکایک میری آنکھ کھل گئی ۔ میں نے دیکھا میں اپنی آرام کرسی پر ہوں اور میرا بچہ خواب میں کسی کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے ۔

چاول چور

راشن کی دکان پر دو طرح کے چاول تھے: چاول نمبر ایک ، چاول نمبر دو - چاول نمبر ایک دیکھنے میں اجلے تھے ، دو نمبر چاول موٹے ، بھدے اور بھورے تھے اور ان میں سے چمڑے کی سی بو آتی تھی -

ترلوچن کی ماں کو اچھے چاول بہت پسند تھے اس لیے وہ دسترخوان پر بھورے چاول دیکھ کر بہت بگڑی - بہو سے بولی : " یہ تم چاول پکاتی ہو یا چپل کا تلا کاٹ کر کھلاتی ہو - لے جاؤ ان چاولوں کو میرے سامنے سے -"

اس پر بہو نے کچھ کھسیا کر ، کچھ گھبرا کر ، کچھ لجا کر اپنے شوہر ترلوچن کی طرف دیکھا ، پھر اپنی ساس کی طرف دیکھا اور پھر جلدی جلدی ، الجھے الجھے سانسوں میں بولی : " تو ماں جی میں کیا کروں - جب راشن کی دکان پر جاتی ہوں جب یہی دو نمبر چاول ملتے ہیں - جب نمبر ایک چاولوں کے لیے پوچھو جب یہی کہتے ہیں کہ وہ چاول تو ختم ہو گئے یا اب کی نہیں آئے یا اگلی بار آئیں گے - وہ اگلی بار کب آتی ہے ؟ کیا معلوم ؟ اب میں کیا کروں ؟ آپ کے لیے وہ بسی کی باسمتی کہاں سے لاؤں ؟ "

بسی کی باسمتی پر ترلوچن کی ماں چونک اٹھی - گو بہو کا

لہجہ نرم اور ریشم میں لپٹا ہؤا تھا پھر بھی اس کے آخری نکیلے فقرے کی دھار نے ماں کے دل پر چوٹ پہنچائی کیونکہ ماں موضع بسی ، کوہ مری کی رہنے والی تھی جہاں ان کے شوہر جسونت سنگھ کی ایک چھوٹی سی زمینداری تھی - سردار جی کے انتقال کے دو برس بعد تک یہ زمینداری ماں کے قبضے میں رہی - پھر ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان بنا اور ماں کو فسادات کے دنوں میں بسی سے بھاگ کر بمبئی آنا پڑا - ماں کو اپنا گھر ، اپنی زمینداری چھوڑنے کا اتنا غم نہ تھا جتنا اپنے چاولوں کو چھوڑنے کا رنج تھا کیونکہ اسے اچھے اچھے چاولوں کو اپنے کھیتوں میں بونے کا بہت شوق تھا - کتنے اصرار سے وہ اپنے خاوند سے کہہ سن کے دور دور سے اچھے اچھے چاولوں کے بیج منگاتی تھی اور پھر پنیری کے سبزے سے دھان کے سنہرے خوشوں تک وہ ان چاولوں کی ہر منزل پر نگہبانی کرتی : اس انہماک ، اس شدت ، اس جذبے کے ساتھ - اکثر خود اس کا خاوند جھلا کر اس سے کہتا : " سردارنی چاول کھانے کے لیے یا بازار میں بیچنے کے لیے ہوتے ہیں محبت کرنے کے لیے نہیں ہوتے -" مگر سردارنی ایسا نہیں سمجھتی تھی - اسے واقعی چاولوں سے عشق تھا اس لیے اس موقعے پر وہ اپنی بہو کا ریشم میں لپٹا ہؤا طعنہ برداشت نہ کر سکی ، اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ بھرائے ہوئے لہجے میں اپنے بیٹے ترلوچن سے مخاطب ہو کے بولی : " بہو مجھے باسمتی کا طعنہ دیتی ہے ، تو یہی بتا ُتو بمبئی میں اتنے سال سے ہے ُتو نے کبھی ہماری بسی کی باسمتی سے اچھے چاول کھائے ہیں ؟ "

" نہیں ماں ۔" ترلوچن نے آہستہ سے کہا ۔

" اور بیگماں چاول بھی تجھے یاد ہوں گے ۔ جب بیگماں کا دھان کھیتوں میں تیار ہو جاتا تھا تو کیسے سارا گاؤں اس کی خوشبو سے مہک اٹھتا تھا ۔ بیگماں ایسے چاول سپنے میں بھی نہیں ملیں گے ۔"

ترلوچن نے پھر آہستہ سے سر ہلا کے کہا : " ہاں ماں ، بیگماں چاول تو اب سچ مچ سپنوں کی طرح ہو گئے ہیں ۔"

بیگماں چاولوں کے ساتھ خود ترلوچن کا بھی ایک شیریں سپنا بندھا ہؤا تھا ۔ ترلوچن نے آہستہ آہستہ یادوں کی پرانی رسی کو اتارتے ہوئے اس سپنے کو کھولا تو اس میں سے راج کنور نکل آئی : لانبی ، بانکی ، حسین اور پلٹ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی گویا کہہ رہی ہو : اچھا ! تو میں سمجھتی تھی تم نے مجھے بھلا دیا ۔

راج کنور ایک ہاتھ میں درانتی ، دوسرے ہاتھ میں بیگماں چاول کے سنہرے خوشے لیے کھڑی تھی ۔ وہ اس کے کھیتوں میں چاول چرانے آئی تھی ۔

ترلوچن نے پوچھا : " یہ تم کیا کر رہی ہو رات کے وقت ہمارے کھیتوں میں ؟ "

راج کنور چپ رہی ۔

ترلوچن نے کہا : " یہ چوری ہے ۔"

راج کنور نے کہا : " چوری نہیں مجبوری ہے ۔"

ترلوچن نے کہا : " کیوں ؟ کیا تمھارا باپ لال سنگھ فصل سے اپنا حصہ نہیں لے جاتا ! "

راج کنور نے غصے سے کہا : " کتنا حصہ ملتا ہے ؟ پہلے اس کی بات کرو ، پھر یہ بتاؤ کہ بیگماں چاولوں میں سے ہمیں حصہ کیوں نہیں ملتا ؟ ہمیں تو وہی موٹے ، بھورے چاول ملتے ہیں - بیگماں چاول تو مالکوں کے لیے ہیں ، مزارعوں کے لیے نہیں -" ترلوچن چپ ہو گیا -

اور راج کنور نے سوچا وہ یہاں کیوں آئی - وہ یہاں نہ آتی تو اچھا ہوتا - مگر وہ کرتی بھی کیا کیونکہ دن کو تو ایسا برا محسوس نہیں ہوتا لیکن رات کو جب ہوا کھیتوں سے بیگماں کی خوشبو اڑا کر اس کے بستر پر لاتی تھی تو وہ بے چین ہو جاتی تھی ، اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دھان کی ہزاروں بالیاں سرسراتی ہوئی اس کے کانوں میں کچھ کہہ رہی ہیں ، جیسے دھان کے لاکھوں دانے اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف تکتے ہیں اور اسے اپنے پاس بلاتے ہیں - ہر روز رات کو بیگماں چاول اسے اپنے پاس بلاتے تھے اور ہر روز وہ اپنے آپ کو روک لیتی تھی ، مگر آج وہ نہ رک سکی اور درانتی ہاتھ میں لیے زمیندار کے کھیتوں میں چلی آئی - آخر یہ چاول میرے کیوں نہیں ہیں ؟ وہ کھڑے ہو کر سوچنے لگی - میں نے انہیں بویا ہے ، انہیں پانی ، دھوپ ، چمک ، گرمی دی ہے - میں ان کے لیے پہروں ، گھنٹوں پانی میں کھڑی رہی ہوں ، گھنٹوں دھوپ میں جلا کی ہوں - میں نے انہیں بچوں کی طرح پالا ہے - آخر یہ چاول میرے کیوں نہیں ہیں ؟

راج کنور نے دھان کی بالیوں کو اپنے رخسار سے لگا لیا اور ترلوچن سے کہنے لگی : " ہائے ، کتنے اچھے ہیں یہ چاول !

ایک ایک دانہ عطر میں بسا ہؤا ہے ۔ اب تم چاہو تو مجھے سردار جی کے سامنے لے چلو یا پولیس میں دے دو مگر میں تو آج فیصلہ کر کے آئی تھی کہ تمہارے کھیتوں سے بیگماں چاول لے کے جاؤں گی ۔"

ترلوچن نے راج کنور کے ہاتھ سے درانتی چھین لی اور کھیت میں بیٹھ کر بیگماں کے اتنے پودے کاٹ ڈالے کہ راج کنور کی دونوں بانہیں دھان کے خوشوں سے بھر گئیں ۔ راج کنور کے رخسار خوشی سے تمتما اٹھے ۔ اس نے دھان کے خوشوں کے درمیان سے ترلوچن کو دیکھا اور بولی : " تم تو کالج میں پڑھتے ہو ، درانتی چلانا وہاں سکھاتے ہیں کیا ؟ "

ترلوچن نے کہا : " کسان کا بیٹا ہوں ۔"

راج کنور نے پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں دھان کے خوشوں کو دیکھا جنھیں وہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی ۔ اس نے عجیب نگاہوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے بھاگ گئی ۔

راج کنور کے جانے کے بعد ترلوچن کو یوں محسوس ہؤا جیسے یہ رات ہے اور رات کا سناٹا ہے ، آسمان پر چاند ہے اور چاند کے گرد ہالہ ہے ، سامنے خوبانی کا درخت ہے اور خوبانی کے درخت پر بلبل بول رہی ہے ، چاروں طرف خوشبوؤں سے لدے دھان کے کھیت ہیں اور کھیتوں کے کنارے کنارے بسی ندی ہولے ہولے بہہ رہی ہے ۔

مگر یہ سب کچھ اس نے راج کنور کے جانے کے بعد محسوس کیا ۔

اب اس رات اتنا کچھ یاد کرنے کے بعد ترلوچن نے ایک بار سر ہلا کے کہا : " ہاں ماں تم سچ کہتی ہو ، بیگماں چاول بہت ہی شیریں اور لذیذ ہوتے ہیں ۔"

" اور تجھے یاد ہے ؟" ماں نے مضطرب لہجے میں کہا ، " جب سردار جی ایک دفعہ سری نگر سے زعفرانی چاولوں کا بیج لے کے آئے تھے ۔ یاد ہے کتنی محنت سے ہمارے مزارعوں نے وہ زعفرانی دھان ہمارے کھیتوں میں تیار کیا تھا ۔ لوگ کہتے تھے زعفرانی چاول کوہ مری میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا ، اور اگر پیدا ہوگا بھی تو اس کی خوشبو مر جائے گی ۔ لیکن جب دھان کھیتوں میں لہلہانے لگا تو دوسرے گاؤں تک زعفران کی خوشبو گئی تھی ۔ ہمارے گاؤں والے خوشی سے پاگل ہو گئے تھے ۔ یاد ہے جب وہ دھان پن چکی سے صاف ہو کے آیا تھا تو ہائے ! کیسے بانکے، تیکھے ، نکیلے، پتلے پتلے چاول اس میں سے نکلے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مہین باریک چاول ۔ لیکن جب ہانڈی میں ڈالو تو کیسے پھیل کے لمبے ہو جاتے تھے ۔ ڈیڑھ ڈیڑھ پور کے لمبے چاول ۔ یاد ہے ترلوچن ؟ "

ترلوچن کو اچھی طرح یاد تھا کیونکہ جس دن زعفرانی چاولوں کی فصل کٹی تھی اسی دن اس کے باپ سردار جسونت سنگھ نے اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا کیونکہ ترلوچن نے مزارعوں کو زعفرانی چاول کی فصل میں سے حصہ مانگنے پر اکسایا تھا ۔ گاؤں میں صرف دو زمیندار تھے: سردار کلونت سنگھ اور جسونت سنگھ ۔ موضع بسی کی ساری زمین ان دونوں سرداروں کے پاس تھی ۔ ترلوچن کا گناہ اگر صرف اتنا ہوتا کہ وہ صرف

کاونت سنگھ کے مزارعوں کو حصہ مانگنے پر اکساتا تو خیر کوئی بات نہ تھی ، جسونت سنگھ اسے معاف کر دیتا ، مگر یہاں تو اس لونڈے نے خود اپنے باپ کے گھر میں بیٹھ کر اس کی زمینداری کو آلٹنے کی کوشش کی تھی مگر وہ تو خود کسان لوگ زمیندار کے ڈر کے مارے نہیں مانے - جو جھنجھوڑے سے تیار بھی ہوئے انھیں جھٹ زمیندار نے بے دخل کر دیا ، اس سے وہ لوگ اور بھی ترلوچن کے خلاف ہوگئے - پھر جب ان زعفرانی چاولوں کی فصل کاٹنے کا زمانہ آیا تو ترلوچن نے ملک پیندا خاں اور ملک لعل خاں اور دوسرے مزارعوں کو اس بات کے لیے تیار کر لیا کہ وہ زعفرانی چاولوں میں سے اپنا حصہ مانگیں -

سردار جسونت سنگھ نے گرج کر کہا : " نہیں ملکا ، نہیں لال خاں یہ نہیں ہو گا - تم لوگوں کو وہی چاول ملیں گے جو تم ہمیشہ لیتے آئے ہو - " ملک لال خاں بولا : " وہی لال ، موٹے ، اجڑ چاول ؟ "

" ہاں ، ہاں وہی موٹے اجڑ چاول جو تم ہمیشہ کھاتے ہو - "

کھیتوں میں ، جہاں یہ بات ہو رہی تھی ، زعفرانی دھان کی سنہری بالیاں جگہ جگہ پڑی تھیں - ملک پیندا خاں ان کی طرف حسرت سے دیکھ کے کہنے لگا : " سردار جی ہم نے ان پر بڑی محنت کی ہے ، اپنے بچوں سے زیادہ محبت سے ان چاولوں کو پالا ہے ، آخر ان پر ہمارا بھی تو کچھ حق ہے ، کچھ تو انصاف کرو - "

اس پر ترلوچن سے نہ رہا گیا ، اس نے باپ سے اجازت لیے بغیر وہیں سب کے سامنے مزارعوں میں زعفرانی دھان کے پودے تقسیم کرنا شروع کر دیے - اس پر اس کے باپ کو سخت غصہ

آ گیا ۔ وہ گھر سے بندوق آٹھا لایا اور قریب تھا کہ اپنے بیٹے کو گولی کا نشانہ بنا دے کہ ترلوچن کی ماں دوڑی دوڑی آئی اور دوسرے مزارعے بھی بیچ میں آ گئے ۔ بڑی مشکل سے ترلوچن کی گلو خلاصی ہوئی مگر اسے گھر سے نکال دیا گیا اور مزارعوں کو بھی چاولوں کا ایک دانہ نہ ملا ۔

ترلوچن نے وہ رات ملک پیندا خاں کے گھر بسر کی ۔ صبح اٹھ کر وہ راج کنور کے گھر کی طرف چلا ۔ اس کے ذھن میں صرف ایک خیال تھا کہ گاؤں چھوڑنے سے پہلے وہ ایک نظر راج کنور کو دیکھ لے مگر راج کنور اپنے گھر پر موجود نہ تھی ۔ پتا چلا کہ وہ گوردوارے گئی ھے ۔ ترلوچن گوردوارے پہنچا لیکن دھلیز پر رک گیا اور دھلیز کے باھر پڑے ہوئے جوتوں میں سے راج کنور کا جوتا تلاش کرنے لگا ۔

گوردوارے کی دھلیز کے باھر بہت سے جوتے پڑے ھوئے تھے : اچھے جوتے ، بُرے جوتے ، نئے جوتے ، پرانے جوتے ، چھوٹے جوتے ، بڑے جوتے ۔ ترلوچن ان میں سے بہت سے جوتوں کو پہچانتا تھا کیونکہ انسان کے ھاتھ اور پاؤں جس چیز کو چھوتے ھیں اس میں اپنے کردار کا خاکہ ، اپنے سماج کی تصویر ، اپنے ماحول کی تفریق ، اس کا تضاد اور کشمکش بھر دیتے ھیں ۔ جوتوں سے آدمی کسی کے بچپن کو مسکراتے ھوئے دیکھ سکتا ھے ، کسی کی جوانی کا گیت سن سکتا ھے ، کسی کے بڑھاپے کی جھریاں گن سکتا ھے ۔ جوتے نہ صرف انسان کی عمر بتاتے ھیں اور جنس بتاتے ھیں بلکہ اس کے طبقے کا نام بھی بتاتے ھیں اور پبلک سیفٹی آرڈیننس کے باوجود بتاتے ھیں کیونکہ بعض انسانوں

کو تو جیل اور پھانسی کا ڈر دلا کر جماعتی تفریق اور طبقاتی جنگ کی سچائی کے اظہار سے روکا جا سکتا ہے لیکن جوتوں کو کوئی نہیں روک سکتا - یہ جوتے بتاتے ہیں کہ ان کے پہننے والے معمولی کسان ہیں - یہ جوتے بتاتے ہیں کہ ان کے پہننے والے ان سے اونچے کسان ہیں - یہ پمپ شو سردار جسونت سنگھ کا ہے - یہ کریپ کا جوتا سردار کلونت سنگھ کا ہے - یہ سیاہ بوٹ تھانیدار حکم سنگھ کا ہے - یہ پشاوری طلائی چپل خوشحال چند پٹواری کی ہے - یہ جوتے باقی جوتوں میں الگ الگ اور خوشحال نظر آتے ہیں جیسے یہ دونوں زمیندار اور تھانیدار اور پٹواری گاؤں کے مزارعوں سے الگ الگ نظر آتے ہیں - جوتے نہ صرف سماج کا تضاد بتاتے ہیں بلکہ حکومت کا رعب بھی بتاتے اور زمیندار کی دولت بتاتے ہیں - جوتے کبھی کبھی اخبار کا کام بھی کرتے ہیں - مثلاً یہ گرگابی جیت کور کی ہے جس کا خاوند پچھلے ماہ فوج سے آیا ہے اور اس کے لیے یہ نئی گرگابی لایا ہے - یہ نیا جوتا ہرنام سنگھ کا ہے جس نے بنیے سے قرض لے کر اپنی بیٹی کی شادی کی ہے اور اس خوشی میں یہ نیا جوتا بنوایا ہے - یہ ایک بیساکھی اور ایک فوجی جوتا رام سنگھ کا ہے جو جنگ میں دو ٹانگیں لے کر گیا تھا اور ایک ٹانگ لے کر واپس آیا ہے - یہ نیا جوتا کس کا ہے ؟ ہمارے گاؤں میں تو اس طرح کے جوتے نہیں پہنے جاتے - ضرور کوئی اجنبی ہمارے گاؤں میں آیا ہے - ترلوچن نے سوچا - پھر اس کی نگاہ راج کنور کے سلیپر پر پڑی اور اس کی نگاہوں میں خوشی چمک اٹھی - تو راج کنور بھی واقعی گوردوارے کے اندر ہے -

ترلوچن گوردوارے کے باہر کھڑا کھڑا چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ وہ گوردوارے کے اندر جائے کہ نہ جائے - اندر اس کا باپ تھا اور راج کنور بھی تھی - کبھی وہ اپنے باپ کے جوتوں کی طرف دیکھتا اور کبھی راج کنور کے سلیپر کی طرف - گاؤں میں خبر پھیل چکی تھی کہ زمیندار نے اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیا ھے - جب وہ گوردوارے کے اندر جائے گا تو لوگ اس کی طرف کس طرح دیکھیں گے ! اس خیال سے بھی وہ رک گیا - یکایک اسے ایسا معلوم ھؤا جیسے دھلیز کے باھر سارے جوتے منہ آٹھا کر اس کی طرف دیکھ رھے ھیں اور ھنس رھے ھیں اور کہہ رھے ھیں : یہ زمیندار کا بیٹا ھے جسے ایک باپ نے اپنے گھر سے نکال دیا ھے - وہ ان کی طنزیہ نگاھوں کی تاب نہ لا سکا اور فوراً گوردوارے سے مڑ کر واپس چلا گیا - جاتے وقت اس نے بڑی حسرت سے ایک آخری نگاہ راج کنور کے سلیپر پر ڈالی اور پھر وھاں سے چپ چاپ چلا گیا -

ترلوچن خاموشی سے اپنے گاؤں سے رخصت ھو گیا اور پھر کبھی واپس نہیں گیا - گارڈن کالج راولپنڈی میں اب اس کا پڑھنا ناممکن ھو گیا تھا اس لیے وہ لاھور چلا آیا - اسے مصوری کا شوق تھا ، یہاں پر وہ سردار گورپال سنگھ ، کمرشل آرٹسٹ کے سٹوڈیو میں ملازم ھوگیا اور کام سیکھتا رھا - پھر لاھور سے وہ بمبئی چلا آیا کیونکہ بمبئی میں ایک اچھے کمرشل آرٹسٹ کے لیے میدان زیادہ وسیع تھا - یہاں آ کے تھوڑے ھی دنوں میں اس کا کام اتنا پسند گیا کہ وہ اپنا سٹوڈیو کھولنے میں کامیاب ھو گیا - اب آٹھ سال سے وہ بمبئی میں مقیم تھا - یہیں اس نے ایک

مراٹھی لڑکی سے شادی کر لی تھی ۔ مالا ، جو اس کی ماں کی بہو تھی ، اب اس کے چار بچے بھی تھے ۔ اب وہ قریب قریب اپنے گاؤں کو بھول سا گیا تھا لیکن کبھی کبھی کسی گاؤں کی تصویر میں رنگ بھرتے ہوئے اس کے ذہن میں راج کنور کے سلیپر اُبھر آتے اور وہ سوچتا : جانے وہ چھوٹے چھوٹے سلیپر آج کہاں ہیں ؟ جانے کس دھلیز کے کنارے کس کا انتظار کر رہے ہیں ؟ آج وہ خود دوسرا تھا ، اس کی دھلیز دوسری تھی ۔ وہاں پر کوئی اور ہی سلیپر پڑے ہوئے تھے ۔ پھر بھی اس سے کیا ہوتا ہے ۔ زخم بھر جاتا ہے لیکن زخم کی یاد تو نہیں بھرتی ۔

اس لیے جب ماں نے اپنے بیٹے سے زعفرانی چاولوں کے بارے میں پوچھا تو بیٹا سر ہلا کے چپ ہو گیا ۔ اس نے دو ایک لمحوں کے لیے حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا ۔ کتنے تعجب کی بات ہے ماں کو زعفرانی چاول یاد ہیں لیکن میرا گھر سے نکالا جانا یاد نہیں ۔ مگر وہ اپنی ماں کی کمزوری اچھی طرح جانتا تھا اس لیے اس وقت چپ ہو رہا ۔ ماں نے ہولے ہولے سر ہلایا اور اپنی بہو کی طرف دیکھ کر کہنے لگی : " مالا ُتو مراٹھی لڑکی ہے ُتو ہمارے گاؤں کے چاولوں کی خوشبو کیا جانے ۔ تو نے کبھی ہماری بسی کی باسمتی کھائی ہوتی تو میں تجھ سے بات کرتی ۔"

مالا نے جل کے کہا : " ہاں ماں جی ہم نے تمہارا گاؤں دیکھا نہ تمہارے گھر کے چاول کھائے ، اب ہم کیا جانیں کوئی سچ کہتا ہے یا جھوٹ ۔" ماں نے کہا : " اچھا تو میں جھوٹی ہوں اور تو سچی ہے ؟ ہاں ہاں ٹھیک ہے میں جھوٹی ہوں اور

تو سچی ہے کیونکہ تو گھر والی ہے اور میرا اب کوئی گھر نہیں ہے ۔" ماں نے آبدیدہ ہو کے کہنا شروع کیا ، " اب میرے کھیت میرے نہیں ہیں ۔ بجلی پڑے ان چاول چوروں پر جنھوں نے میرے چاول مجھ سے چھین لیے ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اس " ایگڑے تگڑے" کرنے والی لڑکی کے گھر آتی ۔"

مالا نے انگلیاں نچا کر کہا : " واہ ! میرے " ایگڑے تگڑے " پر حرف رکھتی ہو اور اپنے " ایتھے ویتھے" کو بھول جاتی ہو ۔ یہ " ایتھے ویتھے" کیا بلا ہے ؟ پنجابی زبان تو بالکل جنگلیوں کی زبان ہے ۔"

ماں نے چلا کے کہا : " اور تیری مراٹھی زبان کیا ہے ، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے منہ میں پتھر ڈال کے بول رہے ہوں ۔"

" پتھر پڑیں تیرے منہ میں ۔"

" تیرے منہ میں ۔"

مالا اور سردارنی دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں اور قریب تھا کہ گتھم گتھا ہو جائیں کہ ترلوچن بیچ میں آ گیا اور ماں اور بہو دونوں کو ڈانٹنے لگا ۔ اپنی ماں اور دادی کو روتے دیکھ کر اور اپنے باپ کو اونچا بولتے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے اور سب سے چھوٹی بچی راج کنور تو بالکل ڈر گئی ۔ (ترلوچن نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کا نام راج کنور رکھا تھا ۔ محبت کیسے ایک سطح سے دوسری سطح پر آ جاتی ہے ۔ محبوب کی چاہت کیسے بیٹی کی الفت میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ یہ بڑا دلچسپ مشاہدہ ہے ۔) ترلوچن نے راج کنور کو اپنی گود میں اٹھا کر پچکارا ، دلاسا دیا ۔ بڑے بچے کو دادی نے سنبھالا اور

دونوں منجھلے مالا کی ساری پکڑ کر رونے لگے - مالا انھیں پیار کرنے لگی اور ساس بہو دونوں اپنی لڑائی بھول گئیں -

ترلوچن نے کہا : " آج نمائش میں جانا تھا ، آج سٹوڈیو بند کیا ، دوسرے سارے پروگرام ختم کر دیے ، بچوں کو تیار کیا ، اب تم دونوں یہ فساد لے کر بیٹھ گئی ہو - مالا کیا تم سے بھی چپ نہیں بیٹھا جاتا ؟ ماں جی تو مزاج کی تیز ہیں ، کیا تم ان کی خاطر اپنی زبان تھوڑی دیر کے لیے دانتوں تلے نہیں داب سکتیں ؟ "

" اچھا تو لو -" مالا نے سچ مچ اپنی چھوٹی سی سرخ زبان کو دانتوں تلے دبا کے دکھایا - اس کی یہ ادا ترلوچن کو بہت پسند آئی - ترلوچن مسکرا دیا - ماں بھی مسکرا پڑیں - مالا گو مراٹھی لڑکی تھی اور اس لیے غیر قوم کی تھی مگر بڑی حسین تھی - آج جب اس نے زبان دانتوں تلے داب کے دکھائی تو سردارنی کو وہ ایک بچی کی طرح معصوم ، خوبصورت اور پیاری معلوم ہوئی - ماں اس کی اس ادا کو دیکھ کر بالکل بے اختیار ہو کر ہنس پڑیں - ساس کو ہنستے دیکھ کر مالا کا انداز بھی بدل گیا ، اس نے جھٹ آ کے ماں کے پاؤں چھو لیے اور ماں نے اسے فوراً گلے سے لگا لیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں : " واھگورو تیرا سہاگ سدا قایم رکھے ! تو تو میری ایک ہی بہو ہے ، مجھ سے لڑا نہ کر -"

" میں کہاں لڑتی ہوں -" مالا اپنے آپ کو ماں کی آغوش میں چھپاتے ہوئے بولی -

ترلوچن نے کہا : " اچھا تو ماں جی اب جلدی سے کھانا

کھا لو ، نمائش میں دیر ہو رہی ہے ۔"

ماں نے کہا : " نہیں ترلوچن میں نمائش دیکھنے نہیں جاؤں گی ۔"

ترلوچن نے کہا : " بڑی اچھی نمائش ہے ۔ روس ، چین ، چیکوسلواکیا ، پولینڈ ، ہنگری اور دوسرے ملکوں کا ، جہاں لوگوں نے نئی زندگی شروع کی ہے ، سب کا حال اس نمائش سے معلوم ہو جاتا ہے ۔"

ماں نے پوچھا : " نئی زندگی سے تمھارا کیا مطلب ہے ؟ "

ترلوچن نے کہا : " میرا مطلب یہ ہے کہ جن جگہوں پر لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کے بعد کس طرح اتنی اچھی زندگی بنائی ہے نمائش میں اس کا پتا چلتا ہے ۔ مثال کے طور پر چین کو لے لو ۔ روس تو خیر بہت ترقی یافتہ ملک ہے مگر چین ہی کو دیکھ لو ، مشکل سے دو برس گزرے ہیں آزادی حاصل کیے ہوئے مگر ان کی نمائش دیکھو تو معلوم ہوتا ہے یہ چین کے لوگ دو سال میں کہاں سے کہاں آگے نکل گئے ہیں ۔"

ماں نے انکار میں سر ہلا کے کہا : " یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ ہم لوگ چار سالوں کی آزادی میں کچھ نہیں کر سکے ، اب تک وہی بھورے اجڑ چاول کھا رہے ہیں ، چینی لوگ کیسے اتنی جلدی آگے بڑھ سکتے ہیں ؟ کیا ان کے چار ہاتھ ہیں یا چار پاؤں ہیں ؟ کیا بات کرتے ہو تم بھی ؟"

" نہیں ماں " ، ترلوچن نے سمجھاتے ہوئے کہا ، " چین کے لوگوں کا کام کرنے کا طریقہ ہم سے الگ ہے ۔ وہاں پر سچ مچ لوگوں نے راج کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے ۔ انھوں نے زمینداری

کو ختم کر کے ساری زمین کسانوں میں بانٹ دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں اب سارے کسان سفید چاول کھاتے ہیں۔"

" تو پھر سیدھی طرح کیوں نہیں کہتا کہ چین والے بھی چاول چور ہیں ۔ ہمارے چاول چھین کر خود کھاتے ہیں ۔ بھلا میں ایسے چاول چوروں کی نمائش میں کیوں جانے لگی ۔"

ترلوچن نے کہا : " ماں چین اور پاکستان اور ھندوستان کی بات ایک نہیں ہے ۔ پاکستان میں تیری زمینداری ملک خاں اور پیندا خاں میں نہیں بٹی اسے تو جالندھر کے پٹھان زمیندار شہباز خاں کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے ۔ صرف زمیندار کا نام بدلا ہے زمینداری نہیں بدلی ہے ۔ بے شک گوردوارے کا پاٹھ ختم ہؤا لیکن مسجد کی جوتیوں کا تضاد بدستور قایم ہے اور زعفرانی چاول والے اسی طرح بھورے چاول والوں پر حکومت کرتے ہیں کیونکہ جو یہاں ھندوستان میں نواب تھے وہاں جا کے بھی نواب رہے اور جو پاکستان میں راجہ تھے ھندوستان آ کے بھی راجہ رہے لیکن چین میں لوگوں نے ہماری طرح دھوکا نہیں کھایا ، انھوں نے تو نوابی اور زمینداری کو ایک سرے سے ختم کر دیا ہے ۔"

ماں نے مسکرا کے کہا : " ترلوچن تو شروع ھی سے چاول چوروں کا دوست رہا ہے اس لیے تو ان کی حمایت کرتا ہے ، اسی لیے باپ نے تجھے گھر سے نکال دیا تھا ۔ تیری باتیں وھی ہیں ۔"

ترلوچن نے کہا : " ماں اب تو چلے گی یا بے کار بحث کرتی جائے گی ۔"

" چلوں گی کیوں نہیں ! اب گھر کے سب لوگ جا رہے

ہیں تو اکیلی یہاں بیٹھ کے کیا کروں گی ۔"

مالا نے کہا : " ہماری ہمسائی پشپا ناگ رتنا بھی چل رہی ہے ، اسے بھی ساتھ لے لیں ۔"

نمائش میں پہنچ کر پشپا ناگ رتنا اور اس کا خاوند روسی نمائش گھر دیکھنے چلے گئے ۔ روسی نمائش گھر سب سے آونچا ، پُرشکوہ اور عمدہ تھا اور مالا کی خواہش بھی تھی کہ سب سے پہلے روسی نمائش گھر کو دیکھا جائے مگر ماں سب سے پہلے چینی نمائش گھر دیکھنے پر مصر تھیں ۔ کہنے لگیں : " میں بھی تو دیکھوں ان چینی لوگوں نے کیسے دو ہی سال میں اتنی ترقی کر لی ہے ۔ مجھے بالکل یقین نہیں آتا اس لیے سب سے پہلے میں تو چینی گھر دیکھوں گی ۔"

ترلوچن اپنی ماں ، بیوی اور بچوں کو لے کر چینی گھر میں داخل ہؤا ۔ آہستہ آہستہ ہر سیکشن سے گزرتے ہوئے اپنی ماں کو ہر بات سمجھائے جاتا تھا :

" دیکھو ماں یہ چین کا کوئلہ ہے ، یہ کچا لوہا ہے ، یہ دونوں مانچوریا کی کانوں سے نکالے جاتے ہیں ۔ مانچوریا چین میں ہے ۔ چین میں لوہے اور کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں ۔"

ماں نے کہا : " مگر ہمارے ہندوستان میں بھی لوہے ، کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں ۔"

ترلوچن نے کہا : " دیکھو یہ چین کے برتن کتنے خوبصورت ہیں ۔"

ماں نے کہا : " مگر ہمارے مراد آباد کے برتن ان سے کم خوبصورت نہیں ہوتے ۔"

ترلوچن نے کہا : " یہ چینی کپڑے ، ریشم کے کپڑے ، سوت کے کپڑے - یہ دیکھو چینی بروکیڈ -"

ماں نے کہا : " مگر ہمارے یہاں بھی ریشمی ، سوتی ہر طرح کا کپڑا تیار ہوتا ہے - بروکیڈ ہمارے ہاں ہوتی ہے اور بنارس کی ساڑھی کا جواب دنیا میں کہیں نہیں ہے -"

ترلوچن نے کہا : " یہ دیکھو دھان اور گیہوں کے خوشوں کا بنا ہؤا سامان : خوبصورت پتلی چٹائیاں ، ٹوپیاں ، بکس ، جوتے -"

ماں نے کہا : " مگر یہ کیا نئی بات ہوئی - ہمارے بسی گاؤں کی کسان عورتیں بالکل ایسا سامان بناتی ہیں -"

" یہ کاغذ کا سامان دیکھو ، یہ ٹیبل لیمپ -"

" مگر کشمیر کی پیپر ماشی اس سے عمدہ ہوتی ہے - یقین نہ ہو تو سری نگر میں جا کے دیکھ لو - میں ایک دفعہ سردار جی کے ساتھ سری نگر جا کے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں -"

" یہ چمڑے کا سامان -"

" مگر —"

" فونٹین پین -"

" مگر —"

" مشینری —"

" مگر —"

" گلوانو میٹر -"

" مگر —"

ترلوچن ہر چیز اٹھاتا گیا اور ماں بڑے مزے سے " مگر"

کہہ کے رد کرتی گئیں ۔ وہ ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے بیچ بیچ میں اپنے ہونٹ خمیدہ کرکے کہتی گئیں : " مگر ہمارے ملک میں تو یہ چیز اس سے بھی عمدہ تیار ہوتی ہے ۔"

ترلوچن کا غصہ اندر ہی اندر بڑھتا جا رہا تھا ۔ عجیب عورت ہے ، اسے کوئی چیز پسند نہیں آتی ۔ مگر وہ ماں سے نمائش گھر میں کیسے لڑ سکتا تھا اس لیے زہر کا گھونٹ پی کر چپ ہو رہا ۔ اب اس نے بد دل ہو کر ماں کو چیزیں دکھانا چھوڑ دیا اور چپ چاپ اپنے خاندان کے ساتھ چلنے لگا حتیٰ کہ یہ لوگ چینی گھر کے آخری حصے میں آن پہنچے ۔ ترلوچن بڑی بے دلی سے اپنی ماں کے ساتھ چل رہا تھا کہ یکایک اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کے ہونٹوں سے خوشی کی ایک چیخ نکلی اور وہ دونوں ہاتھ پھیلائے آگے آگے دوڑی گئی ۔

مالا نے گھبرا کر اپنی ساس کی طرف دیکھا کہ کیا ماجرا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحے خود اس کے منہ سے بھی خوشی کی ایک چیخ نکل گئی اور وہ بھی اپنے خاوند اور بچے چھوڑ کر اپنی ساس کے پیچھے پیچھے بھاگ گئی ۔

سامنے ہزاروں من مکئی ، ہزاروں من گیہوں اور ہزاروں من چاول کے بڑے بڑے انبار لگے تھے ۔ اتنے بڑے بڑے انبار مالا نے تو خیر کبھی نہیں دیکھے تھے کیونکہ وہ بمبئی کی چالیوں میں پلی تھی لیکن ماں نے بھی ، جس کی اپنی زمینداری رہ چکی تھی ، اس نے بھی اپنی زندگی میں اتنا اناج کبھی ایک جگہ اکٹھا نہیں دیکھا تھا ۔ ماں نے خوشی سے اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک چاول کے چمکتے ہوئے انبار میں ڈال دیے ۔ ہاں ،

وهی مهین ، باریک ، پتلے ، بانکے چاول تھے جن کے لیے اس کی روح ترس گئی تھی - سچ سچ یه وهی چاول هیں ! ماں کو یقین نہیں آیا - وہ بار بار اپنی مٹھیوں میں ان چاولوں کو بھر کر اوپر اچھالتی جیسے کوئی ماں انتہائی سرخوشی کے عالم میں اپنے بچے کو هوا میں اچھالتی هے اور پھر نیچے آتے هوئے اسے اپنی آغوش میں دبوچ لیتی هے - ماں آج چینی چاولوں سے اس طرح پیار کر رهی تھی کیونکه آج وہ اپنے کھیتوں میں واپس آئی تھی ، آج اس کے سامنے دهان کے خوشے تھے ، آج گاؤں میں فصل کٹ رهی تھی ، عورتیں نئی زندگی کے گیت گا رهی تھیں - ماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کیونکه آج اسے اپنے چاول مل گئے تھے -

ترلوچن نے دیکھا که صرف ایک اس کی ماں هی ان غلے کے انباروں کے سامنے موجود نہیں هے بلکه بمبئی کی سینکڑوں مائیں اور بھوئیں اپنے دلوں کی تشنه کامی لیے وهاں کھڑی هیں - ان کے سینے متضاد جذبات سے متلاطم تھے - راشن کی دکان کے سامنے تیز جلتی هوئی دھوپ میں لمبی قطاریں ، تھکے هوئے مضمحل اور اداس قدم دھیرے دھیرے کچھوؤں کی طرح اناج کی طرف بڑھتے هوئے ، بھورے بھورے ، پیلے پیلے راشن کارڈ جن پر ان کے نام مجرموں کی طرح لکھے هوئے تھے اور آخر میں اس لمبی قطار کے بعد ایک یونٹ چاول یا دو یونٹ چاول یا دو یونٹ گیہوں - اور جب وہ اس مٹھی بھر اناج کو جھولی میں اٹھا لیتیں تو سوچنے لگ جاتیں : یه هفتے بھر کا راشن هفتے میں کتنے دن چلے گا ! اس مٹھی بھر اناج سے وہ کس کس کی بھوک مٹائیں گی ! اپنے بچوں کی ، اپنے خاوند کی یا اپنے بوڑھے باپ کی - راشن

دینے والے کیا یہ نہیں جانتے کہ بچوں کو تو بہت بھوک لگتی ہے ؟ وہ دن میں ایک یا دو دفعہ نہیں دس دفعہ کھانا چاہتے ہیں کیونکہ ہاتھ پھیلنا چاہتے ہیں اور پاؤں بڑھنا چاہتے ہیں اور آنکھیں روشن ہونا چاہتی ہیں اور کلیاں پھول بننا چاہتی ہیں ۔ لیکن راشن کی دکان پر صرف منجمد یونٹ ملتے ہیں پھولوں کی شبنم اور صبح کا نور نہیں ملتا ۔ وہاں خوراک نہیں ملتی تھوڑی تھوڑی بھوک ملتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی موت ملتی ہے — ایک یونٹ یا دو یونٹ ۔ ان عورتوں کا سینہ ان تلخ یادوں سے گھٹا ہوا تھا ۔ یکایک ترلوچن نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت نے بے اختیار ہو کر اپنے رخسار گیہوں کے انبار سے لگا دیے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کے چہرے پر بچوں ایسی نورانی طمانیت آ گئی جیسے اس نے اپنی ساری زندگی کے راشن کارڈ پھاڑ ڈالے ہوں اور ایک جست لگا کر اس زندگی میں پہنچ گئی ہو جہاں انسان کی محنت گیہوں کی سنہری فراوانی پیدا کرتی ہے اور مکئی کی شہد آگیں شیرینی کو ہر ترسے ہوئے ہونٹ پر پھیلا دیتی ہے ۔ ترلوچن نے بڑی مسرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو اپنے بچوں کو دوسرے بچوں کے ساتھ اناج کے انباروں کے گرد ناچتے ہوئے دیکھ رہی تھی ۔ اس وقت سبھی عورتیں ، مرد ، بچے ، بوڑھے ایک ہی سرخوشی سے سرشار معلوم ہوتے ہیں ۔ ترلوچن نے دیکھا اس وقت ان کے چہرے پر وہ سارے سپنے ابھر آئے ہیں جنھیں انھوں نے آج تک ناممکن سمجھ کر اپنے زندانی سینے کے تاریک گوشے میں قید کر رکھا تھا ۔ اس وقت ان سب لوگوں کی نگاہیں بے اختیار نئے

چین کو سلام کر رہی تھیں ، اس نئی زندگی کو ، اس نئی محنت کو سلام کر رہی تھیں جس نے اپنی متحدہ کاوش سے نئی زندگی کے انبار لگا کر ان کے سامنے رکھ دیے تھے۔ اور دور دور کھڑے ہوئے نمائش گھر کے چینی کارکن بھی مسرت سے مسکرا دیے تھے گویا زبانِ حال سے کہہ رہے تھے : ' جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ تم بھی کر سکتے ہو ۔ تمھاری آنکھوں کے سپنے بھی سچے ہو سکتے ہیں لیکن یہ سپنے صرف دیکھنے سے سچے نہیں ہوتے ۔ پہلے ان میں ہل چلانا پڑتا ہے ، پھر ان میں اپنا خون بونا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر سپنوں کی پہلی فصل سچی ہوتی ہے ۔'

رات کو نو بجے وہ لوگ اپنے گھر پہنچے ۔ راستے میں ماں بالکل خاموش رہی ۔ ترلوچن نے بھی اپنی ماں سے کوئی بات نہیں کی ۔ وہ صرف کبھی کبھی کنکھیوں سے اپنی ماں کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہؤا پاتا ۔ گھر پہنچ کر مالا نے کواڑ کھولے ، بتی روشن کی اور بچوں کی طرح ساس سے پوچھنے لگی :

" بچے بھوکے ہیں ، اس وقت کیا پکاؤں جو جلدی سے تیار ہو جائے ؟ "

ماں نے کہا : " وہی بھورے چاول پکا لو ، جلدی تیار ہو جائیں گے ۔"

مالا نے پوچھا : " آپ بھورے چاول کھائیں گی ، خفا تو نہ ہوں گی ؟ "

" نہیں ۔" ماں نے بڑے اعتماد سے کہا ۔

مالا مسکرانے لگی ، بولی : " ماں جی اگر میں آپ کو آج سفید چاول کھلاؤں تو مجھے کیا انعام دیں گی ؟ "

یہ کہہ کر مالا نے اپنا پرس کھولا اور اسے تپائی پر اُلٹا دیا۔ چینی چاولوں کے دانے تپائی پر بکھر گئے — ایک مٹھی چاول۔

ترلوچن حیرت سے مالا کی طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں اس کا بڑا بیٹا آگے آیا، اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور دو مٹھی چاول نکال کر تپائی پر رکھ دیے۔ پھر منجھلا بیٹا ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور اس کے بعد چھوٹا منجھلا بیٹا۔ دونوں کی جیبوں سے وہی چاول نکلے۔ تپائی پر سفید چاولوں کی ایک ڈھیری سی بن گئی۔ پھر چھوٹی لڑکی راج کنور نے اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنی فراک کے ننھے سے جیب کو ٹٹولا اور اس میں سے سفید سفید چاول نکال کر اپنی ننھی مٹھی بھری اور ماں جی کو دکھا کر بولی: "میں بھی تانول آئی ہوں۔ دیکھو ماں جی، میں تانول آئی ہوں۔" اب سب بچوں کی نظریں، مالا اور ترلوچن کی نگاہیں ماں پر تھیں۔ ماں ان نگاہوں کا بوجھ نہ سہار سکیں، ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا، پھر ان کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں، پھر انھوں نے اپنی انگلیوں کو بے چین پا کر انھیں اپنے دوپٹے کے پلو کو ٹٹولنے دیا اور خود بخود پلو کے کونے سے ایک مٹھی چاول سرک کر تپائی پر آ گرے۔

ترلوچن نے مسکرا کے کہا: "ماں تم بھی! چاول چور!"

ماں سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔ بہت دیر تک خاموشی رہی، پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اُٹھا کے اپنے بیٹے سے کہا: "آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم لوگ چاول چور نہیں ہو، تم چاول پیدا کرنے والے ہو اور تھوڑے چاولوں کو بہت سے چاولوں میں اور بھورے چاولوں کو سفید چاولوں میں تبدیل

کرنے والے ہو اور اگر اس پر بھی دنیا تمھیں چاول چور کہتی ہے تو کہے میں آج سے تمھارے ساتھ ہوں ، واھگورو تمھیں فتح دے ۔" یہ کہہ کر ماں نے ترلوچن کو گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا ۔ ترلوچن کا چہرہ کھل اٹھا ، مالا خوشی سے مسکرانے لگی ۔ بچے سفید چاولوں کو تپائی پر دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور چیخ رہے تھے اور تالی بجا رہے تھے ۔ یہ شور سن کر مالا کی ہمسائی پشپا ناگ رتنا بھی اندر آئی : " کیا ماجرا ہے ؟ آج کس بات کی خوشی ہے ۔"

مالا نے کہا : " آج ہمارے گھر ایک چینی مہمان آیا ہے ۔" مالا نے یہ کہہ کر تپائی پر پڑے ہوئے سفید چاولوں کی طرف اشارہ کیا ۔

ناگ رتنا نے ان چاولوں کی طرف دیکھا ، پھر مالا کی طرف دیکھا اور مسکرا کے بولی : " آج یہ مہمان ہمارے گھر بھی آنا ہے ۔"

امریکہ سے آنے والا ہندوستانی

ایک روز کا ذکر ہے میں چرچ گیٹ سٹیشن سے نکل کر ہوٹل کی جانب فٹ پاتھ پر سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ یکایک کسی نے میرے بالکل قریب آ کر چلا کر کہا: "ہائی کڈ۔"

میں زمین سے دو فٹ اوپر اچھل گیا۔ اچھلنے کے بعد جو نیچے گرا ہوں تو میرے قدم فٹ پاتھ پر نہیں تھے بلکہ چنے بیچنے والے کی ٹوکری پر۔ دوسرے لمحے میں ٹوکری اوندھی ہو گئی، چنے فرش پر پھسل گئے اور چنے والا مجھے گالیاں دینے لگا۔ ابھی میں مڑ کے دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اتنی اونچی آواز میں کون چلا رہا ہے کہ کسی نے زور سے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کے کہا: "ہائی مسکر۔"

اب جو میں غصے میں گھوم کر دیکھتا ہوں تو ایک نوجوان نیلے رنگ کی شارک سکن کی پتلون پر گلابی رنگ کا بش کوٹ پہنے، جس پر سبز رنگ کے تربوز منقش تھے، میری طرف دیکھ کے ہنس رہا ہے۔ میں اس قدر غصے میں تھا کہ چند لمحوں کے لیے میں نے اسے بالکل نہیں پہچانا۔ میرے غصے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس نوجوان نے ناک میں گنگنا کے پھر کہا:

"Dont you know me? جگ موہن لال کالپڑیا۔"

یکایک میں نے اسے پہچان لیا۔ "ارے۔" میرے منہ

سے نکلا ۔

" ارے لونچڑ تم ہو !" میں مسرت سے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا ۔ جگ موہن کالپڑیا ! ہنہہ ! یہاں ہم سب اس نوجوان کو انتہائی پیار سے لونچڑ کہتے تھے ۔ گھر والے جگ یا جگ جگ ۔ حتیٰ کہ اس کی بیوی بھی اسے جگجی کہہ کے پکارتی تھی جو آپ سمجھ جائیں گے کہ لونچڑ سے بہت دور نہیں تھے۔ خیر میں نے اپنے غصے کو دور کرتے ہوئے اسی سے پوچھا :

" کوئی تین سال سے تمھیں نہیں دیکھا ، کہاں تھے تم ؟ "

" سٹیٹس (States) میں ۔"

(امریکہ سے آنے والا ہر آدمی امریکہ کو سٹیٹس کہہ کر پکارتا ہے ۔ "سٹیٹس" کو یہ لوگ کیا کہیں گے ، اس کے متعلق میں کچھ معلوم نہیں کر سکا ۔)

" وہاں کیا کرنے گئے تھے ؟ "

" ہوٹل میں چلو سب بتاؤں گا ، اولٹر پارک میں ٹھیرا ہوں ۔"

ہم دونوں اولٹر پارک کی جانب چلنے لگے۔ اتنے میں چنے والے نے کہا : " عجب شانِ خدائی ہے ۔"

" کیا بات ہے بھائی ؟ " میں نے بڑی متانت سے چنے والے سے پوچھا ۔

" ارے صاحب آپ نے میری ٹوکری توڑ دی ، میرے چنے بکھیر دیے ، میری کوئلوں کی ہنڈیا لڑھکا دی ، اب پوچھتے ہو کیا بات ہے ؟ " چنے والا بازو ہلاتے ہوئے بولا ۔

لونچڑ نے اپنی پتلون کی جیب کا زپ کھولا ، اس کے اندر

ایک پیلے رنگ کا بٹوا تھا ، اس کا زپ کھولا اور اس میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چنے والے کو دے دیا ۔ چنے والا بڑے غور سے پانچ روپے کے نوٹ کو دیکھنے لگا کہ شاید اس نوٹ میں بھی کہیں کوئی زپ نہ لگا ہو ۔ پھر اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد اس نے نوٹ کو جیب میں ڈال لیا اور جب ہم آگے چلے گئے تو ہماری طرف زور سے قہقہہ لگا کر کہنے لگا :
" عجب شانِ خدائی ہے ۔"

جب ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر ہم لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو مجھے اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا ۔ وہ واقعی پہلے سے صحت مند ہو گیا تھا اور موٹا بھی اور اب وہ بہت تیز تیز باتیں کرنے کا عادی ہو گیا تھا ۔ اس سے پہلے، جب وہ ہندوستان میں تھا ، تو سیدھے سادھے انداز میں حلق سے یا منہ سے باتیں کرتا تھا مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا ہر فقرہ جو وہ بول رہا تھا حلق سے نکل کر ناک کی نالیوں میں گھس جاتا ہے اور وہاں سے گھومتا ہؤا نتھنوں کی راہ باہر نکلتا ہے جس سے فقرے کی ساخت میں ایسی گولائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو زبان کو نیا حسن بلکہ اکثر اوقات جملوں کو بالکل نیا مطلب عطا کرتی ہیں ۔ میں بہت دیر تک اس کی باتیں بلکہ اس کی باتوں کی گولائیاں سنتا رہا ، یہ دھیان دیے بغیر کہ ان گولائیوں کے اندر کیا ہے ۔ اس دوران میں مجھے اس کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب موہن اور ہم دونوں منٹگمری کے ایک سکول میں پڑھا کرتے تھے جب جگ موہن ایک بڑی پگڑی اور تہمد باندھے سکول میں پڑھنے کے لیے آیا کرتا تھا اور سب لوگ اس پر

ھنسا کرتے تھے اور شریر بچے اس کی طرف اُنگلی اُٹھا اُٹھا کر کہتے تھے :

لونچڑ دین بجاوے بین
تہمد موٹا پگ مہین

اس وقت بھی لوگ جگ موھن کو لونچڑ کہا کرتے تھے۔ اس وقت میں اس کی باتیں سنتے سنتے وھی گیت زور زور سے گنگنانے لگا ۔

جگ موھن باتیں کرتا کرتا چپ ھو گیا ، پھر ایک وقفے کے بعد شکایتاً بولا : " بھئی اب تو مجھے لونچڑ نہ کہو ، اب تو میں سٹیٹس سے ھو آیا ھوں ، ٹریننگ لے کے آیا ھوں ۔"

" کاھے کی ٹریننگ لے کے آئے ھو ؟ "

" تیل نکالنے کی ۔"

" کس کا تیل نکالنے کی ؟ "

" کاجو کا تیل نکالنے کی ٹریننگ ۔"

" کاجو سے تیل یہاں بھی تو نکل سکتا ھے ؟ "

" نکل سکتا ھے مگر امریکہ میں تیل بہت اچھی طرح نکلتا ھے ۔"

" اوہ !"

اس کے بعد اس نے گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے مجھے وہ چیزیں دکھائیں جو وہ امریکہ سے لایا تھا ۔ جوتوں کے دس بارہ جوڑے تھے ۔ ان جوتوں میں فیتے کی بجائے لوھے کی مہین زنجیر جسے زپ کہتے ھیں لگی ھوئی تھی ۔ جوتا پہن کر زنجیر اوپر کھینچ لینے سے جوتا پاؤں میں خود بخود فٹ ھو جاتا

ہے - سامنے پتلونوں میں بھی بٹن کی بجائے زپ لگی ہوئی تھی - کوٹ کی جیبوں میں بھی زپ لگی ہوئی تھی - قمیضوں اور سویٹروں سے لے کر جرابوں تک زپ لگی ہوئی تھی - پھر اس نے مجھے کیلنڈر دکھائے جن میں ہر مہینے کے صفحے پر ایک ننگی امریکی عورت کی تصویر تھی -

مگر میں نے حیرت سے کہا : " بھئی ان عورتوں کی زپ کہاں ہے ؟ یہ تو بالکل ننگی ہیں -"

اس نے مسکرا کر کیلنڈر بند کیا اور پھر اس کے اوپر ایک زپ چڑھا دی اور کہنے لگا : " دیکھو یہ رہی ، اب کہو امریکہ عالی شان ملک ہے کہ نہیں -"

" واقعی لونچڑ - وہاں جراب سے لے کر عورت تک ہر شے لوہے کی زنجیر میں بندھی ہوئی ہے -"

" شوئر ، شوئر (sure, sure.) -" جگ موہن بات کو نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلانے لگا -

لونچڑ ہر بات میں شوئر ، شوئر (sure, sure) اور فائین (fine) کہتا تھا اور جب کوئی چیز اسے بہت پسند آ جاتی تو زور سے "ھکی" (hookie) کہتا -

چنانچہ اس کی پتلونیں فائن تھیں اور سویٹر ھکی ، اس کی قمیضیں فائن تھیں اور اس کے بش شرٹ ھکی ، اس کے جوتے فائن تھے اور اس کی ٹائیاں ھکی ، اور " ھکی " کے آگے اگر کوئی لفظ ہے تو ریس کورس کا ُبکی ہے مگر کبھی کبھی...

پھر لونچڑ کی ٹائیاں بڑی خوبصورت تھیں - یہ دوھری ٹائیاں تھیں یعنی سیدھی بھی پہنی جا سکتی تھیں اور آلٹی بھی - اس

کے علاوہ ان پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے - کچھ ٹائیاں تو ایسی تھیں جو پرانی چھینٹوں کے کپڑوں کو کاٹ کر تیار کی گئی تھیں ، کچھ ٹائیوں پر پرانے غالیچوں کا دھوکا ہوتا تھا ، کچھ ٹائیوں سے معلوم ہوتا تھا بچوں نے اپنے ہاتھ سے رنگی ہیں ، کچھ ٹائیوں کی گانٹھ اس قدر موٹی آتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ گدھے کی گردن میں باندھنے کے لیے تیار کی گئی ہے -

لونچ-ڑ نے ایک ٹائی مجھے دکھائی : اس پر ایک طرف انعامی معمہ بنا ہؤا تھا ، دوسری طرف زنانہ خواب گاہ کے اندر ایک عورت سو رہی تھی -

میں نے پوچھا : " یہ کیا ہے ؟ "

وہ بولا : " یہ دانشوروں کی ٹائی ہے -"

" وہ کیسے ؟ "

وہ بولا : " تم بوجھو -"

میں نے کہا : " میں امریکی دانشور ہوتا تو بوجھ لیتا ، اب تم کو بتانا پڑے گا -"

وہ بولا : " شوئر ، شوئر - دیکھو یہ ٹائی کہتی ہے : ' دن کو معمہ حل کرو ، رات کو کسی کی خواب گاہ میں گھس جاؤ- ' "

" سبحان اللہ ! کیا دانشوری ہے -" میرے منہ سے بے اختیار نکلا -

" اور یہ ٹائی دیکھو -"

یہ ایک دوہری ٹائی تھی - اس کے ایک طرف پائپ میں سے دھؤاں نکل رہا تھا ، دوسری طرف دو اونچی ایڑی کے جوتے

تھے۔ ایک ٹائی کے زیریں حصے پر ، دوسرا بالکل اوپر اور دونوں ایڑیوں میں دس انچ کا فاصلہ تھا ۔

اس نے کہا : " بوجھو یہ کیا ہے ؟ "

میں نے سوچ سوچ کر کہا : " یہ ٹائی کہتی ہے تمبا کو نوشی کرو گے تو بیوی پیٹے گی ۔"

" ہا ہا ہا !" لونپڑ ہنستے ہوئے بولا ، " تم بالکل گونگ گانزا ہو ، ایک دم گونگ گانزا ہو ۔"

میں نے غصے سے کہا : " اور تم ایک دم لونپڑ ، ایک دم لونپڑ ۔"

وہ میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا : " دیکھو غصے میں مت آؤ ، یہ ٹائی شام کے وقت پہنی جا سکتی ہے ۔ جب شراب پینے کے لیے بار میں جاؤ تو اس پائپ والے حصے کو سامنے کر لو ۔ شراب پیو اور خوبصورت لونڈیوں کی براق ٹانگوں کی طرف دیکھو اور پھر جو پسند آ جائے تو ٹائی کا حصہ بدل کر اس کے ساتھ ڈانس کرو ۔ ڈانس سمجھے ؟ ڈانس یعنی ایک ایڑی اوپر ، ایک ایڑی نیچے ، بیچ میں دس انچ کا فاصلہ ، سامبا ناچ کی طرح ۔ ہا ہا ہا !"

اس کے بعد اس نے بش کوٹ اتار کر ایک امریکی قمیض پہن لی جس کے (cut away collar) کالر ایک دوسرے سے زاویہ منفرجہ بناتے ہوئے اتنے الگ ہو جاتے تھے کہ ان کے بیچ ایک چھوڑ تین ٹائیاں لٹکائی جا سکتی تھیں ۔ مگر میرے دوست نے اسی وقت وہی اونچی ایڑیوں والی اور دھؤاں نکالنے والے پائپ کی ٹائی پہننے پر اکتفا کی اور چونکہ اب شام ہو چکی

تھی اور ابھی بمبئی میں امتناعِ شراب نوشی کا قانون نافذ نہ ہؤا تھا اس لیے وہ مجھے اپنے ھوٹل کی سپیشل بار میں لے گیا ۔

وہ بولا : " تم کیا پیو گے ؟"

میں نے کہا : " صرف وسکی پیوں گا اور اگر زیادہ مجبور کرو گے تو اس میں تھوڑا سا سوڈا ڈال لوں گا ۔"

وہ بولا : " کیا جنگلی ڈرنک ھے ۔ اسے صرف انگریز یا نیم انگریز ھندوستانی پیتے ھیں ۔ اس سے تو یہی بہتر ھے کہ تم کوکا کولا پیو اور چیونگم کھاؤ ۔"

" غم تو میں روز کھاتا ھوں ۔" میں نے جواب دیا ، " کوئی نئی بات بتاؤ ۔"

وہ بولا : " ہوائے ، او ہوائے ۔ آج تمھیں ایک نئی امریکی کاک ٹیل پلاتا ھوں ۔"

اس کے بعد وہ اپنی مگرمچھ کی پیٹی سہلاتا ہؤا بار مین کے پاس چلا گیا اور نہ جانے اسے کیا انٹ سنٹ شرابیں ملانے کو کہتا رہا ۔ بہرحال جب پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ مسرت سے ھاتھ ملتا ہؤا میرے پاس آیا تو بیرے نے دو جام ھمارے سامنے لا کے رکھے ۔ ان میں بھورے رنگ کا سیال تھا جو شراب سے زیادہ گھوڑے کے پیشاب سے مشابہت رکھتا تھا اور ان کے اندر زیتون کا ایک ایک میوہ پڑا ہؤا تھا ۔

اس امریکی کاک ٹیل کا مزہ کڑوا ، میٹھا ، بکسا ، متلی آمیز تھا ۔ ایسا معلوم ھوتا تھا کہ یہ کاک ٹیل ھانولولو میں جنگلی کھوپرے کے سؤر کے گوشت میں سڑا کے تیار کی گئی ھے ۔ میں نے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے زیتون کا میوہ اٹھا کے منہ

میں رکھا ۔ آف ! کس قدر تیز ، تیکھا ، ترش ، سرکے کی طرح زبان کو کاٹتا ہؤا تھا ۔

" ارے لونچڑ یہ کاک ٹیل ھے یا تیزاب ھے ؟ " میں نے جھلا کر کہا ۔

مگر لونچڑ بڑے مزے سے چسکیاں لے لے کر کاک ٹیل پی رہا تھا اور باتیں کرتا جا رہا تھا ۔ دو تین کاک ٹیل پینے کے بعد اس کی حالت عجیب ھو گئی اور اس کی آنکھیں بار روم کی منقش چھت پر گڑ گئیں اور وہ اپنے خیالوں میں کھو گیا :

" ھائے ! مجھے امریکہ کے hot dogs یاد آتے ھیں ۔"

" گرم کتے کیا ھوتے ھیں ؟ عجیب سا نام ھے ۔" میں نے پوچھا ۔

وہ بولا : " امریکہ میں گرم کتے ایک طرح کے کباب کو کہتے ھیں ۔"

" اور گرم کتوں کو امریکہ میں کیا کہتے ھیں ؟" میں نے پوچھا ۔

اس نے مجھے گھور کر دیکھا ، پھر نگاھیں پھیر کر چھت پر گاڑ دیں ۔

" ھائے ! مجھے ھیم برگر (ham burger) یاد آتے ھیں ۔"

" یہ کیا بلا ھے ؟ " میں پھر پوچھے بغیر نہ رہ سکا ۔

لونچڑ تشریح کرنے لگا ۔ دس منٹ کی لمبی تشریح کے بعد معلوم ہؤا کہ ھیم برگر میں تلی ھوئی مچھلیاں بیچی جاتی ھیں ۔

میں نے جل بھن کے کہا : " سالے تو اس کے لیے امریکہ

جانے کی کیا ضرورت ہے ، یہاں ہر گھر میں ہیم برگر ہے ۔"

وہ بولا : " ہائے وہ بیس بال ۔"

" یہ کیا ہوتا ہے ؟ "

بیس منٹ کی تشریح کے بعد پتا چلا کہ امریکی بیس بال وہی تھے جسے ہم لوگ بچپن میں لکڑ ڈانڈا کے نام سے کھیلتے تھے۔ ہمالیہ کے دامن میں اور امریکہ سے بہت دور اور آج سے ہزاروں سال بہت پہلے سے ہمارے بزرگ کھیلتے آئے ہیں ، بیس بال ۔ ہنہہ !

اور نیک اِنگ پارٹی ۔ (necking party)

" وہ کیا ؟ "

لونچڑ کی آنکھیں خوابیدہ ہو گئیں ۔ وہ بولا : " نیک اِنگ پارٹی کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس پارٹی میں کوئی خاوند اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا اور بیوی ہمیشہ اس پارٹی میں کسی دوسرے کی آغوش میں بیٹھے گی ۔ او ہوائے ، او ہوائے مجھے سن سناٹی کی وہ پارٹی یاد آتی ہے ۔"

وہ اپنی یادوں میں کھو گیا :

گرم کتے ، گرم عورتیں ، خالی بوتلیں اور خالی دماغ ۔

یکایک مجھے متلی سی محسوس ہونے لگی ۔

میں نے پوچھا : " تم نے امریکہ میں اور کچھ نہیں دیکھا ؟"

وہ بولا : " کیا ؟ "

" ہاورڈ فاسٹ کو دیکھا ؟"

" کون ؟ "

" پال رابسن کو دیکھا ؟ "

" والٹ وھٹ مین کی شاعری سنی یا پڑھی تھی ؟ بچوں کو سکول جاتے ہوئے دیکھا تھا ؟ "

جگ موھن نے کہا : " میں سٹیٹس میں ان فضول باتوں کے لیے نہیں گیا تھا ۔"

میرا غصہ بڑھتا جا رھا تھا ۔ میں نے لونچڑ کی ٹائی پکڑ لی اور کہا : " تم امریکہ سے یہ ٹائی لائے ھو جس کے ایک طرف میخواری ھے دوسری طرف عریاں رقص ھے ۔ ایک طرف قمار بازی ھے دوسری طرف عصمت فروشی ۔ ایک طرف ٹرومین ھے دوسری طرف ایٹم بم ۔ لیکن یہ تمھارا امریکہ ھے دوست ، میرا امریکہ ایسی ٹائی نہیں ، میرا امریکہ تو ایسی ٹائی ھے جس کے ایک طرف ابراھیم لنکن ھے تو دوسری طرف محنت کرنے والا حبشی ھے ۔ جس کے ایک طرف والٹ وھٹ مین ھے تو دوسری طرف امریکی جہازی ۔ ایک طرف بچے سے محبت کرنے والا باپ ھے تو دوسری طرف خاوند کی وفادار بیوی اور ایک طرف پیک سکل کی جانبازی ھے تو دوسری طرف امن کی فاختہ ۔ میں ایسی ٹائی کو ھمیشہ اپنے گلے میں پہنتا ھوں اور اسے سو بار بوسہ دیتا ھوں ۔"

اس نے اپنی ٹائی چھڑاتے ھوئے کہا : " تم ھمیشہ سے ویسے کے ویسے سیاسی بدھو رھے ۔" پھر اس نے اپنی نگاھیں میری طرف سے ھٹا کر بار کی چھت میں گڑا دیں اور ملامت بار لہجے میں بولا : " ھائے ، اس ویران ملک میں کتنی گھٹن ھے ۔ کاش میں پھر واپس امریکہ جا سکتا ۔"

" کاش تم جا سکتے !" میں نے دلی خلوص اور نفرت سے کہا ۔

" مگر اب کے کون سی ٹریننگ حاصل کروں ؟ " وہ میری نفرت نہ سمجھ کر بڑی بے صبری سے پوچھنے لگا ۔ " وظیفہ تو میں کسی نہ کسی طرح حاصل کر لوں گا ۔"

" اب کے تم انسانی کھوپریوں کا تیل نکالنے کی ٹریننگ حاصل کرنا ۔ اس کے لیے تمھیں یہاں سے وظیفہ بھی مل جائے گا اور پھر امریکی صاحبِ اقتدار طبقے نے اس کے لیے بڑی آسانیاں بہم پہنچا رکھی ہیں ۔"

اتنا کہہ کے میں اس کی میز سے اٹھا اور باہر چلا گیا ۔

لونچڑ چند لمحے ھکا بکا میری طرف دیکھتا رہا پھر اسے اپنے سامنے ایک پرتگیزی حسینہ نظر آئی جو اپنی سیٹ پر بیٹھی بینڈ کی گت پر تال دیے جاتی تھی ۔ اس کی ٹانگیں بڑی خوبصورت تھیں ۔

لونچڑ نے بڑے زور سے کہا : " ھکی ۔"

اور اپنی ٹائی کا رخ بدلنے میں مصروف ہو گیا ۔

محبت کا پھول

شیام کے مرنے سے دو سال پہلے میری اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ یونہی ایک ذرا سی بات پر، اگر کوئی دوسرا ہوتا تو میں لڑتا بھی نہیں۔ مگر شیام میرے اس قدر قریب آ چکا تھا کہ مجھے لڑنا پڑا۔ لڑائی کی ابتدا بھی اس کی طرف سے نہیں ہوئی، گو میرے خیال میں وہی اس کی وجہ تھا مگر اس دو سال کے عرصے میں میں نے کبھی اس سے صلح کرنے کی کوشش نہیں کی، اس نے بہتیری بار کی۔ اس نے میرے بھائی سے کہا، میرے بھائی کی بیوی سے کہا، خود مجھے بلانے کی کوشش کی۔ ایک بار وہ ہربنس، اپنے چھوٹے بھائی اور اپنے چچا کے ساتھ فلورا فونٹین کے قریب مل گیا، مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کا چھوٹا بھائی اور چچا بھی مجھے دیکھ کر مسکرائے کیونکہ وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ شیام نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے اور آگے بڑھتے ہوئے، ہنستے ہوئے میرا استقبال کرنا چاہا۔ یکایک میں نے پلٹا کھایا اور گھوم کر تیزی سے مخالف سمت کو مڑ گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

آخری بار میں نے اسے پدوکن اور چرکوسیوف کے اعزازی جلسے میں دیکھا، جو ان دو مشہور و معروف سوویٹ فلمی فن کاروں کے اعزاز میں ایکسلسیر سینما میں منعقد کیا گیا تھا۔

جس میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی تشریف لائے تھے ۔ عباس اور میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اتنے میں شیام کو دیکھ کر عباس نے اسے ادھر ہی بلا لیا ۔ میرے قریب ایک سیٹ خالی تھی۔ وہ آیا : لمبا تڑنگا ، چھ فٹ کے قریب اونچا ، فراخ ماتھا ، مضبوط ٹھوڑی ، ہونٹوں پر بشاش مسکراہٹ ، آنکھوں میں ذہانت کی لَو ۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہؤا میرے قریب آیا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بولا : " ہیلو بھاپا ۔"

چونکہ میں اس سے عمر میں چھ سال بڑا تھا اس لیے وہ مجھے بھاپا یعنی بڑا بھائی کہا کرتا تھا ، حالانکہ مجھ سے بڑی عمر والے بھی آج کل مجھے بھاپا کہتے رہتے مگر اس میں ان کا قصور کیا ، بعض آدمیوں کے ماتھے پر ہی بھاپا جی لکھا ہوتا ہے ۔

بھاپا جی نے یعنی میں نے اس موقعے پر بھی اس کی گرم جوشی کا استقبال بڑی سرد مہری سے کیا ۔ میں نے زیرِ لب ہی اسے آہستہ سے ہیلو کہا اور پھر سامنے سٹیج پر دیکھنے لگا ۔ اس روز وہ ڈھائی گھنٹے میرے ساتھ بیٹھا رہا ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر نہ کر سکا ۔ وہ بھی بے چین اور دل برداشتہ تھا ، خاموش تھا ۔ دونوں دوست ساتھ ساتھ رہتے مگر خاموش رہتے۔ یہ عجیب سی دوستی تھی جو قہقہوں سے شروع ہوئی اور خاموشی میں کھو گئی کیونکہ اس کے بعد میں نے شیام کو کبھی نہیں دیکھا ۔ مرنے سے چند روز پہلے اس نے مہندر ناتھ کو بلا بھیجا : 'مجھے تم سے ضروری کام ہے ۔' مگر مہندر بھی چند مصروفیات کی وجہ سے اس سے ملنے نہ جا سکا ۔ وہ کیا ضروری کام تھا ۔ کیا وہ ہمارے بگڑے ہوئے تعلقات

کے متعلق تھا ؟ دل میں ہزاروں طرح کے وسوسے آتے ہیں ، ہزاروں خیال آتے ہیں ، مگر اب اس کا کوئی مداوا نہیں ہے ۔ وہ دیوار پھاند کر دوسری طرف چلا گیا ہے ۔ آج میں اسے آواز دیتا ہوں ، اسے پھر محبت اور پیار سے اپنے گلے سے لگانا چاہتا ہوں مگر وہ دیوار کے دوسری طرف چلا گیا ہے ۔

شیام کو فلمی دنیا میں دلچسپی لینے والے لاکھوں لوگ بطور اک ہیرو کے جانتے ہیں مگر بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی نجی زندگی میں بھی ایک ہیرو کی طرح رہتا تھا ۔ سکرین پر اور سکرین کے باہر بھی اس کی الگ ہی شان تھی ۔ ایک اپنی شخصیت تھی جس کا اثر وہ ہمیشہ اپنے سے بہتر اذہان اور شخصیتوں پر بھی چھوڑ جاتا تھا ۔ کھلا خرچ کرنے ، صاف ستھرے اور خوبصورت کپڑے پہننے ، اچھا کھانا کھانے ، اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور زور سے قہقہہ لگانے کی عادتیں اس کی شخصیت کا پُرکشش حصہ تھیں ۔ اس کی گفتگو میں اس کی فطری ذہانت کو بڑا دخل تھا ۔ فلمی دنیا کے ناصاف ماحول میں رہتے ہوئے بھی اس کی شخصیت ایک دھلے ہوئے کپڑے کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی تھی ۔

اس کی فلمی دنیا کا آغاز اچھا نہیں تھا ۔ شروع شروع میں وہ اچھا ایکٹر بھی نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ اسے اپنے آپ کو بنانے سنوارنے اور آگے بڑھانے میں بڑی محنت کرنی پڑی ۔ وہ فلمی دنیا میں کسی سہارے یا وسیلے کے بغیر آیا تھا ۔ وہ جب تک جیا خوشامد اس کی فطرت کا حصہ نہ تھی ۔ شیام خطرناک حد تک صاف گو تھا ۔ جو اس کے جی میں آتا صاف صاف منہ پر

کہہ دیتا تھا اور اس معاملے میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی لحاظ نہ کرتا ۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ منہ پھٹ یا گستاخ تھا یا وہ اپنے سے بڑوں کا ادب نہ کرتا تھا ۔ مگر وہ بے جا خوشامد کا قائل نہ تھا اور نہ اسے سازشوں اور ایک دوسرے کے خلاف چالاکیوں کے جال بننے میں مزا آتا تھا ۔ ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اگر اسے کوئی بات ناپسند ہوتی تو وہ اپنے سے بڑوں کی محفل میں بھی اس کا ذکر کرنے سے گریز نہ کرتا ۔ مثال کے طور پر جوش صاحب کا وہ بے حد عقیدت مند اور پرستار تھا لیکن اگر کسی ادبی ، نجی یا فلمی معاملے پر ان سے بحث ہو جاتی تو شیام ہر بات پر ہاں سے ہاں ملانے سے انکار کر دیتا اور جس بات کو وہ غلط سمجھتا اس کی تردید بڑے زور سے کرتا ۔

ہر جگہ ، زندگی کے ہر شعبے میں وہ اس صاف گوئی کا قائل تھا ۔ محبت کے میدان میں کم از کم تین بار اسے اپنی اسی صاف گوئی کی وجہ سے بے حد تکلیف اٹھانا پڑی ۔ ہر موقعے پر اس نے غم کھا لیا اور اپنی محبت کو ناکارہ ورق کی طرح پھاڑ کر پھینک دیا ، مگر اپنی صاف گوئی کو ترک نہیں کیا ۔ اس نے اپنی زخمی محبت کو قہقہوں کی تابناک تہوں میں چھپا لیا تاکہ کسی کو گمان نہ ہو کہ اس ہنسی کے پیچھے کتنے آنسو چھپے ہوئے ہیں ، مگر اپنی صاف گوئی کو ترک نہیں کیا ۔ صاف گوئی جب اس سے کسی کو تکلیف پہنچے بہت آسان ہوتی ہے ، مگر صاف گوئی جب اس سے خود کو تکلیف پہنچے بہت مشکل ہوتی ہے ۔ شیام اس میدان کا بھی ہیرو تھا ۔

شیام کو دوست بنانے کا فن آتا تھا ۔ دراصل وہ جس روز ایک نیا دوست نہ بنا لے اسے چین نہ آتا تھا ۔ زندگی سے محبت اس کی نس نس میں سمائی ہوئی تھی ۔ اسی محبت سے وہ ہمیشہ بے قرار اور بے چین رہا کرتا تھا ۔ بھاگنے دوڑنے ، ناچنے کودنے ، ہاتھ پاؤں ہلانے اور زور زور سے باتیں کرنے کا اسے بے حد شوق تھا ۔ اور کچھ نہیں ہوگا تو وہ راہ چلتے ہوئے لوگوں سے باتیں کرنا شروع کر دے گا ، باتیں کرتے کرتے ان کے گھر چلا جائے گا ۔ دوسرے دن انھیں اپنے گھر بلائے گا اور وہ لوگ بہت جلد اس کے ماں باپ ، بہن بھائی ، چچا دوست ، یار اور محبوب ہو جائیں گے ۔ شیام کی اپنی چھوٹی سی تیس سالہ زندگی میں بہت سے دوست تھے ، بہت سے سگے بھائی تھے، بہت سے چچا تھے، بہت سی ُموسیاں اور خالائیں تھیں اور بڑی چھوٹی بہنیں اور مائیں تھیں ، بہت سی محبوبائیں تھیں ۔ وہ ایک بڑے وسیع انداز میں بڑی بھرپور زندگی بسر کرنے کا عادی تھا ۔ اس نے اپنی چھوٹی سی زندگی کو بڑی محنت سے اپنی محبت کی بھوک سے بہت دور تک پھیلا دیا تھا : ملٹری کے جوان اور فرانسیسی سپاھی ، اینگلو انڈین لڑکیاں ، جوتشی ، قلفی والے، کتھاواچک ، کپڑا بیچنے والے ، چینی ، حمال ، ڈاکٹر ، ادیب ، فلم ساز ، ریس کے جاکی ، ریلوے کے کلرک ، بے کار گداگر ، ٹھیکے والے ، کھلاڑی ، دانش ور اور بے وقوف ۔ اس کی دوستی کی ہمہ گیریوں نے دور دور تک اپنا اثر پھیلا رکھا تھا ۔ اسی لیے جب آج وہ مر گیا ہے تو دور دور تک اس کی باتوں کی خوشبو باقی ہے ۔

میری اور اس کی ملاقات بہت معمولی طریقے سے ہوئی ، مگر

اس میں بھی اس کی شخصیت کا راز جھلکتا ہے - میں جب آل انڈیا ریڈیو چھوڑ کر پونا کی شالیمار پکچرز میں آیا تو جوش اور ساغر وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ میں ان کے کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا تو شیام جو اس کمپنی کا ہیرو تھا ، چپکے سے اندر داخل ہؤا - میرے قریب کرسی پر بیٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کے بولا : " میرا نام شیام ہے ، میں آپ کو پہچانتا ہوں - میں نے آپ کی فلاں کتاب پڑھی ہے ، فلاں نہیں پڑھی ، فلاں کہانی مجھے بہت پسند آئی ، فلاں پسند نہیں آئی - بہرحال ! کیا آپ کا آج شام کا سینما اور رات کا کھانا میرے ساتھ ہو سکتا ہے ؟ " یہ سب کچھ وہ ایک سانس میں کہہ گیا اور اس کے بعد ہنسنے لگا - پھر ہم سب ہنسنے لگے - بہت جلد اس نے مجھے اپنا بے تکلف دوست بنا لیا - پھر تو ہم اکٹھے رہنے لگے۔ دو سال سے زیادہ عرصے تک ہم لوگ ایک مکان میں اکٹھے رہے حالانکہ شیام بے حد انفرادیت پسند تھا - خود پرستی بھی اس میں تھی مگر دوست سے دوستی اور ذہانت سے سمجھنے اور سیکھنے کی خُو بھی اس میں تھی - چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ میں چلنے کا عادی ہوں اور وہ سائیکل پر گھومنا پسند کرتا ہے تو اس نے میرے لیے سائیکل پر چڑھنا چھوڑ دیا - جب اس نے دیکھا کہ میں ایک قمیص اور پتلون میں گھومنا پسند کرتا ہوں تو وہ بھی کوٹ اتار کر کھلے کالروں والی قمیص میں گھومنے لگا - جب اس نے دیکھا کہ میں رات کو کتابیں پڑھتا ہوں اور وہ روز رات کو سینما دیکھتا ہے تو اس نے ہر روز سینما جانا بند کر دیا - اب اکثر یوں ہوتا تھا کہ اِدھر میں

اپنے کمرے میں بند کوئی کتاب پڑھ رہا ہوں تو وہ بھی اپنے کمرے میں بند ہو کے کتاب پڑھ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا کتابیں پڑھنے کا شوق اس کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ ترقی پسند ادب چاہے وہ دنیا کے کسی کونے کا کیوں نہ ہو وہ ڈھونڈ کے لاتا تھا اور چاہے کچھ بھی ہو خود کتاب خرید کے پڑھتا تھا اور کبھی دوسرے کو اپنی کتاب پڑھنے کو نہیں دیتا تھا بلکہ ہمیشہ یہ مطالبہ کرتا تھا کہ کتاب خود خرید کے پڑھو۔ ان دنوں اس کی آمدنی بھی زیادہ نہ تھی پھر بھی گھر اپنی ماں کو روپے بھیجنے کے بعد اور مکان کا کرایہ، راشن کا خرچ ادا کرنے کے بعد وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابوں پر صرف کرتا۔ انھی دنوں اسے اردو کے بہترین شاعروں اور ادیبوں سے ملنے کے مواقعے ملے اور وہ ذاتی طور پر بھی ان ادیبوں کے بہت قریب ہو گیا اور ان کی تحریک میں اور ان کے مقاصد میں گہری دلچسپی کا اظہار کرنے لگا۔

پونا کی زندگی کی بہت سی باتیں آج یاد آتی ہیں: پرویز کی آمد، پرویز سنگتی کا ہیرو، نوکری کی تلاش میں پونا آیا تھا، اور گو شالیمار میں خود شیام ہیرو تھا مگر شیام نے بڑی فراخدلی سے خود اس کی سفارش کی اور کمپنی کے مالک سے کہہ سن کے اسے اپنی کمپنی میں ایک دوسرا ہیرو رکھوا دیا۔ پھر پرویز بھی ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ بعد میں مہندر بھی آ گیا۔ پرویز، شیام اور مہندر یہ تینوں وجیہہ لوگ تھے۔ چنانچہ ہمارے گھر اکثر لڑکیوں کا جھمگٹھا رہتا تھا۔ بہت سی لڑکیاں ان میں سے کسی ایک نہ ایک پر مرتی تھیں، اور میں ان سب کو دیکھ کے جیتا

تھا - بڑی رونق تھی مگر بے ہودگی نہ تھی کیونکہ پورے گھر کی فضا ادبی تھی ، فلمی کم تھی ، ادبی زیادہ تھی ، اس لیے جوانی کی کوتاھیوں ، خامیوں کے باوجود بھی توازن برقرار رھتا تھا - ہر دوسرے تیسرے دن جوش ، ساغر ، شیام ، پرویز ، مہندر اور میں اور دوسرے مقامی ادب پسند دوست مل بیٹھتے اور ایک چھوٹی موٹی ادبی مجلس منعقد کر لیتے۔ کبھی کبھی بمبئی سے یا یو پی سے یا پنجاب سے دوسرے ادیب آ جاتے تو ھفتوں اپنے ھاں رھتے - ان سب باتوں نے شیام کی فکری زندگی پر بڑا خوشگوار اثر چھوڑا تھا اور اس کے کردار کو نمایاں طور پر آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا -

مون سون کی بارشوں کے بہت سے دھندلے دھندلے دن یاد آتے ھیں ، جب ھم لوگ سینما سے نکل کر اپنے گھر تک اکثر پیدل چلا کرتے تھے - تین چار لڑکے تین چار لڑکیاں ، بارش کی ھلکی ھلکی پھوار ، چمکتی ھوئی آنکھوں میں بھیگی بھیگی نمی ، بھیگی ھوئی سڑک پر بھیگے ھوئے قدموں کی چاپ ، گیلے ھاتھوں میں گیلے ھاتھ اور بھیگی ھوئی گرمی کا احساس ، اور ایک بارش سے دھلے مصفیٰ جذبے کی مسرت اور وہ گیت جو ھم سب لوگ چلتے چلتے گاتے تھے اور جن میں شیام کی آواز سب سے اونچی اور سب سے بے سری ھوتی تھی - میری عینک بار بار پانی کے قطروں سے دھوئی جاتی اور میں بار بار اسے رومال سے صاف کرتا یا کسی ساری کے پلو سے اور "ک" کی زلف رخسار سے چپک کر عجیب سی خوبصورتی پیدا کرتی - اور "پ" کے گھنگھریالے بالوں پر پھوار کے قطرے یوں چمکنے لگتے جیسے اس نے باریک

موتیوں کا جال اپنے بالوں میں ٹکا رکھا ہے اور "ج" شوخی سے اونچے لانبے شیام کے سر کی طرف نگاہ اٹھا کے کہتی : "اب تو تمھارے سر پر برف جم رہی ہے شیام -" اور شیام ایک قہقہہ لگا کے اس کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہتا : "لو دیکھ میری ننھی منھی چوچی موچی گڑیا برف ابھی پگھل کے گر جائے گی - مگر گرما میٹر میرے ہاتھ میں ہے -"

اور وہ رات جب میں اپنی والدہ کی علالت کی وجہ سے سخت پریشان تھا - شیام نے باتوں باتوں میں اپنی والدہ کا ذکر کیا ، جب بالکل بچپن ہی میں اس کی ماں اور باپ دونوں داغِ مفارقت دے گئے - اس کی سوتیلی ماں نے اسے پالا پوسا ، اسے اپنی شفقت اور محبت دی مگر اس سے شیام کی تسلی نہ ہوئی - ہزاروں دوستوں میں گھرے رہنے کے باوجود اس کی پیاسی روح کی تسلی نہ ہوئی -

اس نے مجھ سے کہا : "مجھے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہیں ہے - میں اس کے دودھ کا بھوکا ہوں - میری سوتیلی ماں نے مجھے ماں سے بڑھ کر چاہا ، پھر بھی میں اسے غیر سمجھتا ہوں - بہت سے دوستوں نے مجھے اپنی دوستی اور محبت دی ہے پھر بھی میں محبت کا بھوکا ہوں ، ننگا ہوں ، پیاسا ہوں ، اس دودھ کا نعم البدل مجھے کہیں نہیں ملا - شارک سکن میں ، نہ شراب میں ، نہ محبوب کے بوسے میں - میری یہ تشنگی کبھی نہیں بجھی - میں اس قدر بھوکا کیوں ہوں ؟"

میں نے کہا : "ہم جس وقفے میں پیدا ہوئے وہ دو تہذیبوں کے درمیان کا بحرانی دور ہے - ایک تہذیب مر رہی ہے دوسری

جنم لے رہی ہے ۔ یہ بیچ کا وقفہ بھوک کا وقفہ ہے ۔ محبت کی بھوک ، روٹی کی بھوک ، انسانیت کی بھوک ، پیار ، آرام اور خدمت کی بھوک ۔ یہ تشنگی اس وقفے میں مٹائی نہیں جا سکتی ، ہاں اس سے کام لیا سکتا ہے ۔"

اور شیام جب تک جیا اس نے اس سے مفید سماجی کام لیا ۔ اس نے حتی المقدور اپنے سوتیلے بھائی ، بہنوں اور ماں کی خدمت کی اور آخری دم تک خدمت کرتا رہا ۔ اس نے سماج کے رواج توڑ دیے اور جس مسلمان لڑکی سے محبت کرتا تھا اس سے شادی کی ۔ اس نے گزشتہ تین چار سال میں ترقی پسند ادب تحریک کی ہر ممکن مدد کی ۔ ان کی اپیل پر دستخط کیے اور اس کی دوسری بمبئی کنوینشن کے لیے چندہ بھی دیا ۔ بمبئی میں ہر اچھے مقصد کے لیے وہ اپنی مدد کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا اور یہ مدد وہ منہ بنا کے سنجیدہ ڈھنگ سے نہیں کرتا تھا بلکہ ہنستے ہوئے ، مذاق کرتے ہوئے ، باتوں باتوں میں اس طرح کر جاتا تھا کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ اسے واقعی زندگی کے بلند مقاصد سے اس قدر پیار ہے ۔

"من کی جیت" نے شیام کو فلم کا مشہور ستارہ بنا دیا جس نے اس کی شہرت اور دولت میں ترقی دی ۔ اب وہ پہلی صف کا فلمی اداکار بن گیا ، مگر اب بھی وہ پہلا شیام ہی رہا : بے باک ، نڈر ، بے خوف ، صاف گو ، محبت کا بھوکا ۔ اپنی دو سال کی بچی کے بارے میں وہ اپنی بیوی تاجی سے روز کہا کرتا تھا :

" میں اسے فلمی سٹار نہیں بناؤں گا ، اسے میں چھ زبانوں آٹھ زبانوں ، دس زبانوں ، دنیا کی سب سے بڑی زبانوں کا عالم

بناؤں گا ۔ لوگ کہتے ھیں کہ بیٹے کو پڑھانا چاھیے ، میں سمجھتا ھوں میری یہ بیٹی ھی میرا بیٹا ھے ۔ اسے میں پیرس کے تصویر گھروں میں بھیجوں گا ، روسی بیلے کی تعلیم دلواؤں گا ۔ میری بیٹی دنیا کی بہترین کتابیں پڑھے گی ، خود لکھے گی بھی ۔ وہ ایک بہت بڑی دانشور ھو گی ۔ کیوں تاجی ؟ "

اور تاجی مسکرا کے کہتی : " ھاں شیام تمھارے خواب ضرور پورے ھوں گے ۔"

شیام کہتا : "جو کام میں نہیں کر سکا وہ یہ کرے گی ، جس کی بھوک مجھے ھے ، اس کی سیرابی میرے بچوں کو میسر ھوگی ۔"

" جو دنیا میں نے نہیں دیکھی وہ یہ دیکھے گی ۔"

محبت کا بھوکا !

پرسوں محبت کا بھوکا اچانک مر گیا ۔ وہ بالکل تندرست اور صحت مند تھا ۔ اس کے رخسار گلاب تھے ، اس کی ھنسی جوان تھی ، اس کا قہقہہ بلند تھا ۔ اس کے بازوؤں میں قوت اور دل میں زندگی کی محبت تھی ۔ صبح سویرے ھی اس نے اپنی ماں کو پونا بھیجا ۔ اپنی بہن کو جس کی شادی ھونے والی تھی ، اس سے مذاق کرتا رھا ، پھر اس نے اپنی بچی کو گود میں آٹھا کر پیار کیا ، پھر تاجی کا ھاتھ پکڑ کے کہا : " آج شام کو سینما چلیں گے ، میں سٹوڈیو سے ٹھیک چھ بجے واپس آ جاؤں گا ۔"

اس کے بعد وہ شبستان کی شوٹنگ میں چلا گیا ۔

آؤٹ ڈور شوٹنگ پر گھوڑ سواروں کا سین تھا ۔ وہ گھوڑے پر چڑھ کر ھنسی مذاق کرتا رھا ، اپنے گھوڑے کو تھپتھپاتا رھا ، گھوڑے سدھانے والے سے مذاق کرتا رھا ، فلم کے سین

کے لیے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا رہا ، یکایک گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے اس کی رکاب ٹوٹ گئی اور شیام ایک جھٹکے سے زمین پر آ گرا اور گھوڑے کی تیز دولتی اس کے سر پر لگی - اور اس کے ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا - اسی وقت اس بے ہوشی کے عالم میں اسے لبرٹی سینما کے پاس ایک نرسنگ ہوم میں بھیجا گیا - ڈاکٹروں نے کہا : "حادثہ خطرناک ہے ، اس سے موت واقع ہو سکتی ہے -" مگر شیام نے ڈاکٹروں کو تسلی دی : " گھبراؤ نہیں ، میں لڑنا جانتا ہوں ، میں بچ جاؤں گا ، کوئی فکر نہ کرو میں ٹھیک ہو جاؤں گا ، سب ٹھیک ہو جائے گا ، یہ خون شون کا بہنا سب بند ہو جائے گا ، سمجھے ڈاکٹر صاحب !"

ڈاکٹر مسکرایا -

شیام لڑتا رہا -

شام کے پانچ بجے اس پر جانکنی کی حالت طاری ہو گئی -

چھ بجے کے قریب جب کہ اسے اپنی بیوی سے سینما جانے کے لیے ملنا تھا - چھ بجے کے قریب اسے ذرا سا ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور ایک زور کی چیخ ماری اور دم توڑ دیا -

محبت کا بھوکا مر گیا -

سونا پوری کے شمشان گھاٹ پر میں نے اسے آخری بار دیکھا اور اس سے کہا : " اٹھ بے بھوتنی کے سالے ! تیرا دوست تجھے بلانے آیا ہے - روٹھا ہؤا جگری دوست خود تجھے گلے لگانے آیا ہے - آ پرانی رنجشوں اور شکایتوں کو خیر باد کہہ دیں اور ہاتھ میں ہاتھ دیے دھندلی دھندلی بارشوں ، ہلکی ہلکی چاندنی میں بھیگی بھیگی سڑکوں پر آوارہ پھریں - اٹھ ، او بے سرے

گانے والے ، بے ہنگم مونٹ ایورسٹ کے چچا شیام ، آج تیرے ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش پر میں سہگل کی ساری میٹھی دھنوں کو قربان کر دوں گا ۔ آٹھ ، میری روٹھی جوانی کے روٹھے دوست ، آج تیرے لیے سارے جہان کی محبتوں کے خزانے لایا ہوں ۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اور تم کبھی ایک دوسرے سے روٹھیں گے نہیں بلکہ دونوں مل جل کر دوسرے دوستوں کے ساتھ اس جہان نو کی تخلیق کریں گے جہاں کوئی محبت بھوکی نہیں رہے گی ، کوئی نگاہ ترسی نہیں رہے گی ، کوئی لَے بے سری نہیں رہے گی ۔"

مگر آج شیام مجھ سے نہیں بولا ۔ وہ آج مجھ سے کٹّی کاٹ گیا تھا اور مخالف سمت پر ، چپ چاپ خاموش اپنی بھوکی محبت کے زخموں کو چھپا کے چلا گیا ۔

دھند اور آگ اور شعلے لپکتے ہوئے ...

جو مر جاتے ہیں وہ مر جاتے ہیں ، پھر واپس نہیں آتے ۔ پھر کبھی نہیں ملتے ، پھر کبھی نہیں سنتے ، پھر کبھی نہیں ہنستے ۔ لیکن جو زندہ ہیں وہ سن سکتے ہیں ، وہ تو ہنس سکتے ہیں ۔ اس لیے آؤ اپنے سارے روٹھے ہوئے دوستوں کو منا لیں ۔ گزر جانے والے شیام کی یاد میں زندہ رہنے والے شیاموں کو گلے سے لگا لیں ۔

آج محبت بھوکی ہے اور ایک دو سال کی بچی رو رہی ہے ۔

محبت کی خاطر ، بچوں کی خاطر ، شیام کی ہنسی کی خاطر ۔

زندگی کو آواز دو اور اپنے آنسوؤں کو جھٹک دو کیونکہ شیام نے ہمیں رونا نہیں ہنسنا سکھایا ہے ۔

سو روپے

میں نے سو روپوں کا کام کیا تھا ۔ مجھے سو روپے ملنے چاہییں اس لیے میں نے سیٹھ سے بات کی ۔

سیٹھ نے کہا : " سولہ تاریخ کو آنا ۔"

میں سولہ تاریخ کو گیا ۔

سیٹھ وہاں نہیں تھا ۔ اس کا بڈھا مینیجر جس کی چندیا صاف تھی اور جس کا ایک دانت باہر نکلا ہؤا تھا اور جو اپنے اسسٹنٹ کو کسی غلطی پر ڈانٹ رہا تھا ، مجھ سے بڑی شفقت سے کہنے لگا : " تم نے سو روپے کا کام کیا ہے ، تم کو برابر سو روپے ملیں گے ، مگر آج سیٹھ یہاں پر نہیں ہے کل آنا ۔"

میں نے پوچھا : " اگر سیٹھ کل بھی یہاں پر نہ ہؤا تو ؟"

مینیجر بولا : " تو میں انتظام کر رکھوں گا ، تم فکر نہ کرو تمھارا پیسہ تم کو مل جائے گا ۔"

میں نے دفتر سے باہر نکل کر دو پیسے کا پونا پتہ ، سکیلی مسالہ اور ہری پتی والا پان کھایا ۔ دو پیسے میں دیسی کالا کانڈی اور ٹھنڈک والا پان بھی کھا سکتا تھا اور ملٹھی ، لال مصالحہ والا پان بھی اور بنارسی چھوٹا پتہ ۔ گیلی ڈلی اور الائچی والا پان یا سوھنی تمباکو والا ، مگر میں نے صرف پونا پتہ سکیلی مصالحہ اور ہری پتی والا پان ہی کھایا کیونکہ مجھے

بھوک بہت لگ رہی تھی اور میری جیب میں صرف ڈیڑھ دو آنے تھے اور یہ پان جو میں نے کھایا کافی موٹا ہوتا ہے اور دیر تک منہ میں رہتا ہے۔

پھر میں نے ایک آنے کا ٹرام کا ٹکٹ لیا اور ٹرام میں بیٹھ کر میں نے زور سے سیٹھ کی بلڈنگ کی طرف تھوک دیا۔

دوسرے دن پھر سیٹھ وہاں نہیں تھا۔ اس کے مینیجر نے کہا: " سیٹھ آج بھی یہاں نہیں ہیں اور پھر تمہارے حساب میں کچھ غلطی بھی ہے۔"

مجھے غصہ آ گیا۔ میں حساب دے چکا تھا۔ مینیجر اسے دس بار چیک کر چکا تھا پھر بھی کہیں سے غلطی نکل آتی ہے مگر میں کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ مینیجر کا لہجہ بہت نرم تھا اور اس کا ہر فقرہ ریشم میں لپٹا ہؤا تھا اس لیے میں نے بھی نرمی سے کہا: " میرا حساب تو بہت صاف ہے۔"

اتنا کہہ کے میں نے اپنی خاکی پتلون کی جیب سے ایک میلا پرزہ نکالا اور مینیجر کے ساتھ گیارھویں دفعہ تفصیلات چیک کرنے بیٹھ گیا: اتنے پیسے ریگ مال پھیرنے کے، اتنے پیسے روغن کے، اتنے پیسے مزدوری کے۔ ریگ مال اور روغن کی رسیدیں میرے پاس تھیں۔ مزدوری پہلے سے طے ہو چکی تھی۔ سیٹھ کا فرنیچر میری محنت سے جگ مگ، جگ مگ کر رہا تھا۔

مینیجر نے کہا: " ہاں حساب ٹھیک ہے، اچھا کل آنا۔"

" مگر کل ضرور۔" میں نے ذرا زور دے کر کہا۔

" ہاں کل ضرور۔" مینیجر نے چندیا کو سہلاتے ہوئے کہا۔

باہر آ کر میں نے دو پیسے کا پان بھی نہیں کھایا، ایک

آنے کا ٹرام کا ٹکٹ بھی نہیں لیا اور فیروز شاہ مہتا روڈ سے سائین تک پیدل گیا ۔

مگر دوسرے دن میں پھر سیٹھ کے دفتر گیا ۔

آج دفتر میں سیٹھ موجود نہیں تھا ، مینیجر بھی غائب تھا ۔ مینیجر کا اسسٹنٹ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ایک سنگل چائے اپنے سامنے رکھے کچھ سوچ رہا تھا ۔ اس کا چہرہ بہت زرد تھا ، ماتھے کے قریب ، سفید رخساروں کے قریب پیلا اور ٹھوڑی کے قریب مٹیلا سا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کے چہرے کی ہڈیوں کے اوپر کھال کے بجائے میلے میلے ، پیلے پیلے کاغذ تراش کے منڈھ دیے ہوں ۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا ۔

اسسٹنٹ نے پیالی سے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا ۔ میں نے پوچھا : " سیٹھ کہاں ہیں ؟ "

وہ بولا : " سیٹھ اپنے دوسرے دفتر میں گیا ہے ۔"

" اور مینیجر کہاں ہے ؟ "

" مینیجر سیٹھ کے تیسرے دفتر میں گیا ہے ۔"

" تو مجھے یہاں چوتھی منزل پر کس لیے بلایا ہے ؟ " میں نے ذرا غصے میں تیز ہوتے ہوئے کہا ۔

اسسٹنٹ نے چائے کا آخری گھونٹ بھی نگل لیا ۔ آہستہ سے بولا : " تم یہاں بیٹھ جاؤ ، مینیجر ابھی آتا ہوگا اس سے بات کر لینا ۔"

میں ایک کرسی پر ساڑھے دس بجے سے لے کر پونے دو بجے

تک بیٹھا رہا ۔

پہلے میں نے سوچا کہ ایک شیشے کا ٹکڑا لے کر اس سارے روغن کو آتار دوں جو میں نے اتنی محنت سے اس فرنیچر پر چڑھایا تھا ۔ پھر میں نے سوچا کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اسسٹنٹ کے نقلی چہرے سے پیلے پیلے کاغذ کے ٹکڑوں کو آتارتا جاؤں حتیٰ کہ اندر کی ہڈی ننگی ہو جائے ۔ پھر میں نے سوچا : مینیجر کو جان سے مار دینا بہتر ہوگا ۔ بہت دیر تک سیٹھ کے لیے سزا سوچتا رہا ۔ آخر خیال آیا کہ اس کے سارے جسم پر بی نمبر کی موٹی ریگ مال پھیر دوں گا تو اس کی ساری کھال ادھڑ کر ننگی ہو جائے گی ۔ پھر مینیجر آ گیا ۔

مسکراتے ہوئے بولا : " تمھارا کام ہو گیا ہے ، مگر چیک ملا ہے سو روپے کا ۔ اور اب پونے دو بج چکے ہیں اور دو بجے بنک بند ہوتا ہے اور بنک یہاں سے دو میل دور ہے اور کل چھٹی ہے اور پرسوں اتوار ہے ۔" میں نے مایوسی سے کہا :

" ہاں ۔" مینیجر مسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا ۔

میں نے بے حد رکھائی سے کہا : " چیک مجھے دے دو ۔"

پانچ منٹ اور چیک لینے میں گزر گئے کیونکہ چیک پر میرا نام غلط لکھا ہؤا تھا ۔ محمد شفیع کے بجائے محمد رفیع لکھا ہؤا تھا ۔

" چچ چچ " مینیجر نے کہا ، " بڑی غلطی ہو گئی ۔ محمد شفیع لکھتے لکھتے محمد رفیع لکھ گیا مگر کوئی حرج نہیں ، اب تم سوموار کو آ کے نیا چیک لے لینا ۔"

میں نے کہا : " مگر یہ تو بیرر چیک ہے ۔ نام کی غلطی سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ تم میرے نام کی رسید لے لو اور مجھے

چیک دے دو ، سوموار کو میں کہاں آؤں گا کہیں اور دھندا کروں گا ۔"

" اچھا تو لے جاؤ ۔" مینیجر نے رکتے رکتے کہا ۔

چیک لے کر باہر آیا تو دو بجنے میں پونے نو منٹ تھے ۔ کسی صورت سے پیدل چل کے میں بنک نہیں پہنچ سکتا ۔ سو روپے کا چیک میرے ہاتھ میں تھا مگر ابھی کاغذ کا پرزہ تھا ۔ اسے سو روپوں میں تبدیل کرنے کے لیے بنک تک پہنچنا ضروری تھا ۔ دو بجے سے پہلے صرف ایک صورت ہو سکتی تھی ۔

میں نے فیصلہ کر لیا اور چلا کر کہا : " اے ٹیکسی ۔"

پیلی چھت اور سیاہ جسم والی ٹیکسی زوم سے میرے قریب آ کر رک گئی ۔

میں نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا : " کالبا دیوی روڈ کے ناکے پر چلو اور ذرا تیز چلاؤ ۔" جب کالبا دیوی روڈ کے ناکے پر پہنچا تو دو بجنے میں دو منٹ تھے مگر بنک کالبا دیوی روڈ پر نہیں تھا ۔ گو چیک پر یہی لکھا تھا مگر بنک کالبا دیوی روڈ کے ناکے پر نظر نہ آیا ۔ دو ایک دکانداروں سے پوچھا ، کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی ۔ کوریا میں جنگ تیز تھی ، بھاؤ بھی تیز جا رہے تھے، کس کو وارنش کرنے والے کے سو روپوں کی فکر تھی ۔

ہار کر میں ایک پنجابی سکھ ہارمونیم بنانے والے کی دکان میں گھس گیا ۔ " آئیے آئیے کیا باجہ چاہیے آپ کو ؟" سردار نے اپنی اس آری کو چھوڑ کر جس سے وہ لکڑی کاٹ رہا تھا مجھ سے مسکرا کر کہا ۔

میں نے کہا : " سردار جی مجھے باجہ نہیں چاہیے، مرکنٹائل بنک کا پتا چاہیے ۔ چیک پر تو لکھا ھے کالبا دیوی روڈ اور یہاں کہیں ملتا نہیں ۔"

سردار جی نے مسکرا کر کہا : " بادشاھو ! وہ بنک تو ساتھ والی گلی میں ھے ، اِدھر گھوم کے سٹہ بازار کے اس طرف پرانے چاندی والے سندر کے پاس ۔" میں نے سردار جی کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا بھاگا واپس ٹیکسی کے پاس ۔ جب بنک میں پہنچا تو دو بج کر چار منٹ تھے ۔ اُصولاً میرا چیک کلرک کو نہیں لینا چاہیے تھا مگر معلوم ھوتا ھے کہ کلرک چیک پڑھنے کے علاوہ چہرہ پڑھنا بھی جانتا تھا ۔ اس نے خاموشی سے چیک مجھ سے لے لیا ۔ پھر اُلٹا کر کے دیکھا ، مجھ سے کہنے لگا : " اس پر دستخط تو کر دو ۔"

میرا نام محمد شفیع تھا لیکن میں نے محمد رفیع لکھا ۔ یہ محمد رفیع کون تھا ؟ یہاں کہاں سے آیا تھا ؟ کب پیدا ھؤا ؟ اس کی صورت کیسی تھی ؟ اس کے ماں باپ کون تھے ؟ کون جانتا ھے ؟ کچھ زندگیاں ایسی ھوتی ھیں جو چیک پر لکھی جاتی ھیں اور چیک پر ھی کاٹ دی جاتی ھیں ۔

میں ٹیکسی والے کا چکتا کرنے لگا ۔ دو روپے دو آنے ۔ ٹیکسی چھوٹی تھی اس لیے میٹر بڑھا نہیں ۔ ٹیکسی بڑی ھوتی تو پانچ سات روپے کھل جاتے ۔ میں نے خوشی سے اطمینان کا سانس لیا ۔ اتنے میں کسی نے آ کے میرے شانے پر زور سے ھاتھ مارا اور کہا : " کہو دوست ، میرے یار ، بڑے ٹیکسی میں گھوم رھے ھو آج ۔"

میں نے گھوم کر دیکھا : میرا دوست اسحاق تھا ۔ اسحاق بڑے کھلے دل کا آدمی تھا ۔ وہ خود تو عبدالرحمان سٹریٹ کے اندر ایک خوجے کے مکان میں ایک تنگ سے کمرے میں رهتا هے اور وهی دهندا کرتا هے جو میں کرتا هوں ۔ یعنی وارنش کا اور پرانے فرنیچر کو پھر سے نیا کر دینے کا لیکن اس کی محبوبه محمد علی روڈ اور کرافورڈ مارکیٹ کے ناکے پر ایک اچھے هوٹل میں رهتی هے ۔ میں نے دیکھا هے بڑی خوبصورت عورت هے ، بڑے بڑے سیٹھوں کے پاس جاتی هے ۔ یه اسحاق اس سے پہلے اس کے پاس ڈرائیور تھا ۔ اسحاق کو یه کام پسند نہیں آیا اور وہ اس سے الگ هو گیا ۔

وہ عورت اس کو بہت پسند کرتی هے ۔ یه بھی اس کو چاهتا هے مگر وہ اس کو اپنے ڈهرے پر لانا چاهتی هے اور یه اس کو اپنے طریقے پر رکھنا چاهتا هے ۔ دونوں میں همیشه لڑائی هوتی هے ۔ پھر یه اس سے دس باره روز نہیں ملتا ۔ پھر وہ اس سے ملنے آتی هے ۔ ایسے هی یه چکر چلتا رهتا هے ۔ کبھی کبھی اسحاق جب کوئی موٹی رقم کما لیتا هے تو اسے جا کے دے آتا هے اور اسے ایک لیکچر بھی جھاڑ آتا هے مگر جس عورت کے پاس اچھا هوٹل هو گا ، اچھی جوانی ، صحت اور خوبصورتی هو گی اور سونے چاندی والے سیٹھ هوں گے وہ وارنش کرنے والے اسحاق کی بات کیوں سننے لگی ۔ سوچنے کی بات هے یارو !

میں نے اسحاق سے پوچھا : ” مجھے بھوک لگی هے ، کچھ کھاؤ گے ؟ “

وہ بولا : ” هاں بھوکا تو میں بھی هوں ، چلو فیروزے

کبابیے کی دکان پر۔"

فیروزے کبابیے کی دکان سے فارغ ہو کر اسحاق نے مجھ سے دس روپے اُدھار لیے اور اپنے راستے پر چلا گیا۔ مجھے اسحاق بہت پسند ہے۔ اس کے پاس پیسے ہوں تو نا نہیں کرے گا، سب کو کھلائے پلائے گا اور جب پیسے نہیں ہوں گے تو میرے سوا کسی سے قرض نہیں مانگے گا، بھوکا مر جائے گا مگر کسی سے اُدھار نہیں لے گا۔ ایسا دوست جو دنیا میں میرے سوا کسی سے اُدھار نہ لے کہاں ملتا ہے۔ مجھے اسحاق کی دوستی پر بڑا فخر ہے۔ میں جب بھی اسحاق سے ملتا ہوں، ایک عجیب سی خوشی، لاپروائی، بچوں کی سی مسرت محسوس کرتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دل میں کوئی غم نہیں ہے، کوئی تکلیف نہیں ہے۔ جیسے ساری دنیا کھلونوں سے بھری ہوئی ہے اور اس کے سارے بازار میرے لیے سجے پڑے ہیں۔ بعض آدمیوں میں کچھ ایسی ہی بات ہوتی ہے۔

اس وقت اسحاق سے مل کر میرا جی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ میں نے کرافورڈ مارکیٹ سے دو سیب خرید کر کھائے، ایک بھکاری کو دو آنے دیے۔ وہاں سے چلتا چلتا بوری بندر آ گیا لیکن جیب میں روپے تھے اور ابھی گھر جانے کو جی نہ چاہتا تھا اس لیے بوری بندر سے ہارن بی روڈ پر ہو لیا۔

ہارن بی روڈ کی دکانیں مجھے بہت پسند ہیں۔ خاص طور پر ان دکانوں کے نمائشی دریچے جن میں آئینے لگے ہوئے ہیں اور نی آن کی روشنیاں اور قد آدم کانچ کی بڑی بڑی شفاف سلوں کے پیچھے کیسی کیسی خوبصورت چیزیں پڑی ہوئی ہیں: خوبصورت

اور تولیے جنھیں دیکھ کر خود بخود نہانے کی خواہش پیدا ہوتی تھی - یہ سب میں خرید سکتا تھا - اس سے اگلے دریچے میں مردوں کے لیے شب خوابی کے گاؤن تھے : بھڑکیلے ، ریشمی منقش گاؤن جنھیں پہن کر وارنش والا بھی مصر کا پاشا معلوم ہو - ستر روپے کا گاؤن اور اس سے زیادہ رقم میرے پاس تھی - میں نے اس گاؤن کو اپنے تخیل میں پہنا اور ایک ایرانی غالیچے پر اڑتا ہؤا بہت دور چلا گیا - ہوا صاف تھی - میرے نیچے خوبصورت باغوں والی زمین گھوم رہی تھی اور ہری ہری دوب میں ایک چھریری نازک اندام ندی ایک پہاڑی حسینہ کی طرح دھوپ سینک رہی تھی -

میں نے اس غالیچے کو اس ندی کے کنارے اترنے کا حکم دیا - غالیچہ ندی کے کنارے اتر آیا اور خود بخود بچھ گیا - پھر خود بخود کہیں سے ایک صراحی آ گئی اور ایک مرمریں ہاتھ اور دو آنکھیں اور ایک حسین چہرہ - پھر مجھے کسی نے ٹھوکا دیا اور کرخت لہجے میں کہا :

" آگے بڑھو ، اب کسی اور کو بھی دیکھنے دو ، آدھے گھنٹے سے یہیں کھڑا ہے نہ لینا نہ دینا -" میں نے مسکرا کر ایوان اینڈ فریزر کے وردی پوش غلام کی طرف دیکھا جو مجھے ڈانٹ رہا تھا اور آگے چل دیا - بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ میرے پاس ایک ہوا میں اڑنے والا ایرانی غالیچہ ہے اور جیب میں ستر روپے سے بھی زیادہ کی رقم ہے - میں اس وقت اندر جا کے اس گاؤن کو خرید سکتا تھا مگر میرا جی نہیں مانا - ہارن بی روڈ پر اس سے بہتر بھی کوئی چیز ہو گی - آگے چل کے

دیکھا جائے - اس وردی پوش غلام کو تو کسی وقت بھی شکست دی جا سکتی ہے -

آگے چلتا چلتا بہت سی دکانیں دیکھتا بھالتا میں جگدمبا لال پائل کی دکان پر پہنچ گیا - یہاں نمائشی دریچے میں کیمرے پڑے تھے جنھیں میں خرید سکتا تھا - کیمرے خرید کے میں ان تمام فرنیچروں کی تصویر لے سکتا تھا جو پرانے تھے لیکن جنھیں میرا وارنش اور میری محنت اتنا خوبصورت بنا دیتی تھی کہ وہ بالکل نئے فرنیچر کی طرح جگمگانے لگتے تھے - میں نے سوچا یہ کیمرہ لے کر میں اسحاق کے پاس جاؤں گا اور اس سے کہوں گا : " چل ، آج تیری اور تیری محبوبہ کی اکٹھی تصویر لیں گے -" میں نے اپنا ایرانی غالیچہ منگوایا اور کیمرہ ہاتھ میں لے کر سارے جہان کے خوبصورت مناظر کی تصویریں آتارنے لگا -

کیمرے کے ساتھ جادوبین پڑی تھی جس میں دیکھنے سے تصویریں بالکل اپنی مکمل گہرائی کے ساتھ نظر آتی ہیں یعنی جیسے آدمی بالکل آپ کے سامنے چل پھر رہے ہوں اور مکان آپ کے سامنے ہو بہو جیسے آپ کا گھر - تصویر اپنی لمبائی ، چوڑائی اور موٹائی کے ساتھ اتنی اچھی دکھائی دیتی ہے کہ سینما میں بھی اتنی اچھی معلوم نہیں ہوتیں - بچپن میں ایک بڑھیا ایک بڑی سی جادوبین ہمارے محلے میں لایا کرتی تھی اور ہم لوگ ایک پیسہ دے کر تماشہ دیکھتے تھے - اس جادوبین کو دیکھ کے میرا دل خوشی سے کانپنے لگا اور میں دکان کے اندر داخل ہو گیا -

کونٹر پر میں نے ایک نوجوان سے پوچھا : " یہ جادوبین کتنے کی ہے ؟ "

" ساڑھے سینتیس روپے کی ۔"

نوجوان بڑی خوبصورت قمیص پہنے تھا ۔ اس کے بال گھنگھریالے اور پیچھے گھومے ہوئے نی آن کی روشنی میں نئے فرنیچر کے وارنش کی طرح چمکتے تھے ۔ اس کے ہونٹوں پر بھی جوانی کی وارنش تھی ۔ اس کے لبوں پر ایک مغرور مسکراہٹ تھی جو صرف چیک لکھتے وقت پیدا ہوتی ہے ۔ اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر ایک خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی دکان میں میرے بعد داخل ہوئی تھی ۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور ایک میلے میلے چہرے والا ناآسودہ گجراتی جو غالباً اس کا اسسٹنٹ تھا ، میری طرف آ گیا ۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا وارنش جگہ جگہ سے اکھڑا ہؤا ہے اور اس نے مسکرانے کی بھی کوشش نہیں کی ۔

میں نے کہا : " یہ جادوبین مجھے دکھاؤ ۔"

اس نے جادوبین میں ایک مدور فلیتہ رکھ کے میرے ہاتھ تھما دیا اور مجھ سے کہا : " اسے گھماتے جاؤ ، یوں سوچ دبا کر ، نئی نئی تصویریں تمھارے سامنے آتی جائیں گی ۔" میں نے بٹن دبا دیا : ٹارزن ہاتھی پر سوار سامنے سے چلا آ رہا تھا ۔

میں نے بٹن دبا دیا :

ٹارزن آبشار میں چھلانگ لگا رہا تھا ، نیچے مگرمچھ کتنے خوف ناک معلوم ہو رہے تھے ۔

میں نے بٹن دبایا :

پھولوں کے گجرے ، پھولوں کے ہار اور پھولوں کے لہنگے پہنے ہوئے ، ہوائی جزیرے کی لڑکیاں ناچ رہی تھیں ۔

میں نے بٹن دبایا :

ساحل کی ریت پر شراب اور پھل اور بسکٹ اور کھانے کی چیزیں ایک شفاف طشتری میں پڑی تھیں اور ایک عورت ریت پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی - اس کا منہ میرے اس قدر قریب تھا کہ میں نے جلدی سے بٹن دبا دیا -

ایرانی غالیچہ زمین پر آ گیا -

میں نے گجراتی خارش زدہ کلرک سے کہا : " یہ جادوبین تو بہت اچھی ھے میرے بچپن کی جادوبین سے ہزار درجے بہتر ھے ، کتنے میں دو گے ؟ "

وہ مسکرائے بغیر بولا : " ساڑھے سینتیس روپے کی جادوبین آتی ھے - یہ مدّور رنگین تصویروں والے فتیلے ایک درجن اس کے ساتھ لینا پڑیں گے - دس روپے کے یہ ھوں گے ، سیلز ٹیکس اس کے علاوہ ، پچاس کے اوپر رقم جائے گی -

میں نے جیب میں ھاتھ ڈال کر دس دس کے نئے کرکرے نوٹوں کو تھتھپایا - آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ بالکل سچ ھے کہ اس سے پہلے میرے دل میں جادوبین کے سوائے اور کوئی تصویر نہ تھی لیکن نوٹوں کو ھاتھ لگانے سے ایک دم مجھے دھچکا سا لگا اور بہت سی تصویریں بٹن دبائے بغیر ھی میرے سامنے گھوم گئیں -

ایک بچہ پھٹی ھوئی قمیض پہنے گلی کے فرش پر بیٹھا ھے اور رو رھا ھے - میں نے پہچانا میرا بچہ تھا - ایک عورت کی شلوار کا پائنچہ دوسرے پائنچے سے اونچا ھے ، اس کی اوڑھنی سے اس کے سر کے الجھے ھوئے بال باھر نکلے ھوئے نظر آ رہے

تھے ۔ میں سمجھ گیا کہ...

ایک آدمی دروازے میں کھڑا ہے ۔

اس کی صورت ہر لمحہ بدلتی جاتی ہے ۔ اس کا غصہ ہر لمحہ بڑھتا جاتا ہے ۔

کبھی یہ مالک مکان کا مینیجر بن جاتا ہے ؛

کبھی دودھ والے سیٹھ کا نوکر ؛

کبھی بجلی والی کمپنی کا عہدہ دار ؛

کبھی پانی والے دفتر کا ۔

میں نے بٹن دبا دیا :

اب میرے سامنے گھر کے فرش پر ایک خالی طشتری پڑی تھی جس پر ایک گلاس اوندھا پڑا ہؤا ہے ۔

نوٹ میری جیب سے باہر نکلے، پھر وہیں هاتھ میں رہ گئے۔

خوبصورت کلرک، خوبصورت لڑکی کو کیمرہ بیچ کر کونٹر پر واپس آ گیا ۔ میں جلدی سے گھوم کر دکان سے واپس جانے لگا ۔ باهر جاتے جاتے ، میں جانتا تھا کہ وہ کلرک اپنی بہترین وارنش شدہ مسکراهٹ سے میرے پھٹے ہوئے کالر دیکھ رہا ہے ۔ میری خاکی زین کی پتلون دیکھ رہا ہے جس کی پیٹھ پر دو جگہ ٹکڑے سلے ہوئے ہیں ۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ پر ہنس رہا ہے ۔

میں نے اچھی طرح سے دانت پیس لیے، اچھی طرح سے جیبوں میں هاتھ ڈال کر نوٹوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور نمائشی دریچوں سے نگاہ اٹھا کر سیدھا بوری بندر کی طرف چلنے لگا ۔

چلتے چلتے مجھے محسوس ہؤا کہ جیسے کسی نے مجھ سے شدید دھوکا کیا ہے ۔ کسی نے مجھے سو روپے دے کر دو سو

روپے چھین لیے ھیں - اس کے ساتھ ھی میرا ایرانی غالیچہ اور جادوبین بھی چھین لی ھے - کسی نے زور سے میرے منہ پر چپت ماری ھے - کسی نے میرے ھر نوٹ پر لکھایا ھے :

" تمھارے لیے نہیں -"

میرے قدم ھر لحظہ بھاری ھوتے گئے اور میں نے محسوس کیا کہ میری محنت کا ھر نوٹ آداسی کی ایک لمبی زنجیر ھے ، جسے میں خود اپنے ھاتھوں سے کھینچ رھا ھوں -

بوری بندر پہنچ کر یکایک میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج گاڑی سے اپنے گھر واپس نہیں جا سکتا - آج میں پیدل ھی بوری بندر سے سائن جاؤں گا -

بہت رات گئے میں تھکا ماندہ اپنے گھر لوٹا - میری بیوی متفکر تھی اور میرا انتظار کر رھی تھی لیکن جب اس نے نوٹ دیکھے تو خوش ھوگئی - اس لیے وہ میری اداسی کا مطلب نہ سمجھ سکی -

بولی : " لیکن یہ کیا بات ھے ، تم آج خوش ھونے کے بجائے آداس ھو ؟ "

میں نے چارپائی پر بیٹھتے ھوئے کہا : " جان من ! آج مجھے پتا چلا ھے کہ یہ دنیا بہت بوڑھی ھو چکی ھے اور مجھے ایسی دنیا چاھیے جو بچوں کی طرح مسکرا سکے -

وہ بولی : " میں نہیں سمجھی ، تم کیا کہہ رھے ھو -"

میں نے کہا : " جان من ! میں کہہ رھا ھوں کہ اب پرانے فرنیچر پر وارنش کرنے سے کام نہیں چلے گا - اب نیا فرنیچر لانا ھو گا -"

برھم پُترا

توسار جولے باتی توسار گھورے شاتھی
تمھارے ھاں چراغ جلتا ھے اور گھر میں ساتھی بھی ھے
اسار تورے راتی اسار تورے تارا
میرے لیے رات ھے اور تارے
توسار اچھے ڈانگا اسار اچھے جول
تمھارے لیے زمین ھے۔اور میرے لیے پانی
توسار بوشے تھاکا اسار چولا چول
تمھارے لیے آرام ھے میرے لیے ھمیشہ کا چلنا
(ٹیگور کا ایک گیت)

اپنے جوڑے میں سفید گلاب کا پھول ٹکائے اور ایک گہرے بسنتی رنگ کی ساری پہنے جس کا لہریہ گہرا سرخ تھا ، لوتیکاسین اپنے منے کی طرف مسکراتی چلی آ رھی تھی ۔ منا لکڑی کے گھوڑے پر سوار تھا اور وہ اسے چابک مار مار کے اپنی دانست میں سرپٹ دوڑا رھا تھا ۔ جب منے نے اپنی ماں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس نے لکڑی کے گھوڑے کی باگ زور سے کھینچی اور گھوڑا آلٹ گیا اور منا نیچے اور گھوڑا اس کے اوپر جا گرا ۔

منا رونے لگا ۔ لوتیکا نے ھنستے ھنستے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا ۔

منا روتے روتے بولا : " گھوڑا بڑا شیطان ہے ، اس نے مجھے نیچے گرا دیا ۔"

لوتیکا بولی : " تو نے بے چارے کی باگ جو زور سے کھینچ دی تھی ۔"

منا بولا : " میں نے ساں کو دیکھا تھا نا ؟"

لوتیکا نے اسے چوم کر اپنی چھاتی سے لگا لیا ۔ بولی : " اچھا دیکھ میں بازار جا رہی ہوں ، منے کے لیے کیا لاؤں ؟ "

منا بولا : " میں تو باجہ لوں گا ، گھوڑے پر چڑھ کر باجہ بجاؤں گا اور اپنی فوج کے آگے آگے چلوں گا ۔"

یہ کہتے کہتے منے کا چہرہ اس وقت بڑا سنجیدہ ہو گیا ۔ بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر بکھر گئی تھیں ۔ وہ رونا بھول گیا تھا ۔ آنسو ابھی تک اس کے گالوں پر چمک رہے تھے ۔ لوتیکا نے رومال سے اس کے آنسو پونچھ دیے اور اس کی لٹوں میں انگلیاں پھیر کر انھیں پیچھے جھٹکا دیا ۔

" لوتیکا تُو کدھر جا رہی ہے ؟ "

یہ چاچی کی آواز تھی ۔ چاچی ہاتھ پونچھتی ہوئی رسوئی سے باہر نکل رہی تھیں ۔ چاچی کی عمر بہت بڑی تھی ، ان کے سر کے بال سفید تھے ، چہرے پر جھریاں تھیں ، جسم سوکھا سوکھا اور پتلا تھا ۔ ان کا چہرہ بہت سے غموں اور دکھوں کی کہانی کہتا تھا لیکن اس پر بھی چاچی کے چہرے پر ایک عجیب سوہنی معصومیت تھی جو جانے اس بڑھاپے میں بھی جب آدمی سب کچھ کھو بیٹھتا ہے ، کیسے باقی رہ گئی تھی ۔ آج کل تو بچوں کے چہروں پر بھی ایسی معصومیت نہیں ملتی ۔ چاچی نے

کیسے اور کس جتن سے اس معصومیت کی حفاظت کی ہو گی ، اس کا راز نہیں کھلتا ۔ چاچی کی عمر ساڑھ اور آٹھ سال کی تھی ۔ اس عمر میں چاچی نے اپنے گاؤں کو جو برہم پترا کے کنارے آباد تھا ، دو دفعہ بہتے دیکھا ، دو دفعہ پھر بستے دیکھا ۔ سات دفعہ چھوٹے چھوٹے کال آئے اور تین بڑے بڑے کال اور آخری کال میں تو چاچی کا سارا پری وار ختم ہو گیا اور چاچی اپنا گاؤں چھوڑ کر لوتیکا کے ھاں کلکتے چلی آئیں ۔ رائے بہادر موجدار لین میں لوتیکا کا گھر تھا ۔ چاچی جب پہلی بار کلکتے آئیں تو انھیں یہ گھر بھی بڑی مشکل کے بعد ملا ۔ اور جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئیں تو اس وقت سامنے کے مندر میں آرتی اتاری جا رھی تھی لیکن لوتیکا کے گھر میں آرتی کے وقت بھی اندھیرا تھا اور لوتیکا کا پتی سیڑھیوں پر سے دبے پاؤں اتر کر باھر جا رہا تھا ۔ وہ چاچی کے لیے صرف ایک منٹ کے لیے رکا اور پھر یہ کہہ کر فوراً چلا گیا : ” چاچی میں پھر آؤں گا ، اس وقت میں رک نہیں سکتا ، ایک ضروری کام ہے ۔ لوتیکا میری غیر حاضری میں تمھارا سب خیال رکھے گی ۔“ اور پھر چاچی نے دیکھا کہ لوتیکا کے پتی نے ایک لمحے کے لیے لوتیکا کا ھاتھ اپنے ھاتھ میں لیا اور پھر اسے چھوڑ دیا اور تاریک سیڑھیوں سے نیچے اتر کر عقب کے دروازے سے باھر جانے لگا ۔ پچھواڑے کی گلی میں چاچی نے دیکھا کہ لوتیکا نے بڑی احتیاط سے اس کے لیے دروازہ کھولا ، روشنی کی ایک پتلی سی لکیر تڑپتی ہوئی اندر آئی اور پھر دروازہ بند ہو گیا ۔ لیکن اس ایک لمحے میں چاچی نے دیکھا کہ لوتیکا ایک لانبے قد کی ، سانولی صورت والی ،

دلکش لڑکی ہے - اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں - ان آنسوؤں کو دیکھ کر چاچی ایک لمحے کے لیے لرز گئی تھی - لوگ دھان ، کپاس اور گندم بوتے ہیں ، چاچی نے تو اپنی زندگی میں صرف آنسو بوئے تھے - انھوں نے سوچا تھا کہ شاید یہاں کلکتے میں یہ آنسو نہیں ہوں گے - یہ آنسو تو صرف برہم پترا ندی کے کنارے ہوتے ہیں جہاں کسان چاول کے موتیوں کی فصل بوتے ہیں اور آنسو کاٹتے ہیں - کیا یہ سنسار ہی ایسا دکھ بھرا ہے ؟ ایک لمحے کے لیے چاچی جس آرام اور سکھ کی تلاش میں کلکتے آئی تھیں ، اسے بھول گئیں - انھوں نے دھیرے سے لوتیکا کا ہاتھ پکڑ کے بڑے نرم لہجے میں پوچھا تھا : " کیا بات ہے بہو ؟ "

لوتیکا مسکرا کر اپنے آنسوؤں کو پی گئی - اس نے چاچی کا ہاتھ زور سے دبا کر بڑی مدھم آواز میں کہا : " کچھ نہیں چاچی - آؤ ، اوپر آ جاؤ - "

لوتیکا نے چاچی کا بقچہ سنبھال لیا تھا اور اسے اوپر لے گئی تھی -

اس دن سے آج تک چاچی نے لوتیکا کے پتی کو پھر کبھی نہیں دیکھا تھا - چاچی اپنا گاؤں چھوڑ کر اس لیے یہاں آئی تھیں کہ یہاں برہم پترا نہیں ہے - اب انھیں احساس ہؤا جیسے برہم پترا یہاں بھی ہے اور جب تک لوتیکا کا پتی یہ دریا پار نہ کر لے وہ واپس گھر نہیں آ سکتا - بس اتنا ہی انھیں اندازہ ہو سکا - وہ اکثر بالکونی میں کھڑے کھڑے گیلے کپڑے ٹانگتے ہوئے سوچا کرتیں - اور ان کی آنکھوں کی کانپتی ہوئی حیران

پتلیاں نیچے گلی میں بھاگتی ہوئی مخلوق کو دیکھ کر آزردہ ہو جاتیں - یہ سب لوگ کس طوفان کی پیشوائی کو بھاگے جا رہے ہیں - ابھی پانی کہاں چڑھا ہے ؟ کہاں یہ آگ لگی ہے ؟

لیکن چاچی ان سوالوں کا جواب ٹھیک سے نہ دے سکتیں اور اپنی کانپتی ہوئی پتلیوں سے نیچے گلی میں گزرنے والی مخلوق کو حیرانی سے دیکھتی رہتیں -

اس وقت چاچی کی نگاہوں میں وہی موہوم سا ڈر تھا جب انھوں نے لوتیکا کے قریب آ کر پوچھا : " تو کہاں جا رہی ہے لوتیکا ؟ "

اور پھر لوتیکا کو چپ دیکھ کر چاچی نے خود ہی لرزتی ہوئی آواز میں پھر پوچھ لیا : " کیا جلسے میں جا رہی ہے ؟ "

لوتیکا کی مسکراہٹ بڑی اچھی تھی لیکن چاچی کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے کوئی مرنے سے چند لمحے قبل زندگی کے سارے دکھ اور درد کو سمجھ لے اور سمجھ کر نیلے آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دے - چاچی کی مسکراہٹ میں شفق کی موہنی تھی لیکن لوتیکا کی مسکراہٹ صبح کا پہلا اجالا تھی جو بہت دور سے اور شاید کہیں بہت نزدیک سے آئی تھی - اور ستاروں کی چلمن اٹھا کر آہستہ آہستہ تاریکی کا نقاب الٹ رہی تھی - بڑی میٹھی میٹھی ، مدھم مسکراہٹ جیسے کوئی ریشم کے اوپر ریشم رکھ دے لیکن یہ مسکراہٹ ایک عجیب رفاقت اور مضبوطی کا احساس بھی لیے ہوئے تھی جیسے برہم پترا بھی ہے اور طوفان بھی ہے ، لیکن ایک کشتی بھی ہے جو پار لے جا سکتی ہے -

چاچی کے ھونٹ کانپے ، ایک سفید لٹ گھبرا کے مرجھائے ھوئے رخسار پر گر پڑی - انھوں نے ایک عجیب ملتجیانہ انداز میں لوتیکا سے کہا : " تم جلسے میں ضرور جاؤ گی ؟ "

لوتیکا ھنسی - اس نے وہ سفید لٹ بڑی محبت سے اٹھا کر چاچی کے کان کے پیچھے گھما دی اور بڑے پیار سے بولی : "میں تو آٹھ بجے سے پہلے گھر پہنچ جاؤں گی چاچی - آتے ھی مجھے کھانا دے دینا - سچ مجھے بہت بھوک لگ رھی ھو گی -"

لوتیکا جلدی سے یہ کہہ کر تاریک سیڑھیوں سے اترنے لگی ، چاچی سیڑھیوں کے اوپر منے کا ھاتھ پکڑے دیر تک کھڑی رھیں - پھر دروازہ کھلا ، روشنی کی ایک پتلی سی لکیر تڑپی ، پھر اندھیرا چھا گیا - منے نے کہا : "چاچی چلو مجھے مہا کوی کے ننھے چاند کے گیت سناؤ -"

چاچی اب سب کچھ بھول گئیں - انھیں مہا کوی ٹیگور کے ننھے چاند کے گیت بہت پسند تھے - آج انھوں نے منے کو وہ گیت سنایا : جب بچہ کھو جاتا ھے اور ماں اسے ڈھونڈتی ھے ، اور اس کا نام لے کر پکارتی ھے ، اور بچہ ایک جوھی کا پھول بن کر اس کی آغوش میں آ گرتا ھے -

گیت گاتے گاتے چاچی کو یاد آیا ، کتنے خوبصورت جوھی کے پھول تھے - ایک ایک کر کے وہ سب برھم پترا کی لہروں میں کھو گئے اور آخر میں چاچی کی گود خالی رہ گئی - سب کچھ مٹ گیا - موتیوں ایسے بیٹے اور موتیوں ایسے دھان کی فصلیں - آخر میں صرف برھم پترا ندی رھی اور زمیندار کی گڑھی... چاچی

گیت گاتے گاتے چپ ہو گئیں اور انھوں نے منے کو اٹھا کر زور سے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا ۔

منے نے مچلتے ہوئے کہا : " اوں ہوں ! چاچی ایک گیت اور سناؤ ۔"

اور اب کے چاچی نے وہ گیت سنایا جس میں چاند کی کشتی آسمان کی ندی میں ہولے ہولے بہتی ہے اور بچہ اس میں بیٹھا ہؤا اسے ہولے ہولے کھیتا جاتا ہے ۔

اور منا یہ کشتی کھیتے کھیتے سو گیا ۔

رائے بہادر سوجمدار لین سے گزر کر لوتیکا اب گھنشام داس بازار میں چل رہی تھی ۔ چلتے چلتے لوتیکا کو دو ایک بار ایسا محسوس ہؤا جیسے کوئی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے ۔ اس نے گھوم کر دیکھا کوئی نہیں تھا ۔ شاید اس کے دل کا واہمہ تھا ۔ کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا ۔ پھر بھی احتیاط ضروری ہے ۔ لوتیکا نے سوچا شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگ چکی ہے سنبھل کے چلنا چاہیے۔ لوتیکا نے چاروں طرف دیکھا : بازار میں لوگ آ جا رہے تھے ، دکانیں سجی ہوئی تھیں ، لوگ سودا سلف بھی خرید رہے تھے ، بسیں اور ٹرامیں بھی گزر رہی تھیں پھر بھی لوتیکا کو ایسا محسوس ہؤا جیسے یہ سارا امن و سکون سطحی ہے ، جیسے یہ فضا اک پتلے باریک فولای بلیڈ کی سطح کی طرح تنی ہوئی ہے ۔ یوں کہ ذرا ہاتھ لگانے سے خون بہہ نکلے گا ۔ لوگ بھاگ چل رہے تھے ، کام کر رہے تھے ، بوجھ اٹھا رہے تھے اور کہیں کہیں ہنسی کی آواز بھی سنائی دیتی تھی ۔

پھر بھی لوتیکا کو ایسے جان پڑتا کہ جیسے اس کے سارے پس منظر میں غصے کی ایک گونج ہے - جیسے کہیں دور آفق پر لال لال روشنی نظر آ کے گم ہو جاتی ہے - جیسے ریت کے کنارے دھیرے دھیرے لہریں آگے بڑھ رہی ہوں اور لوتیکا چوکنی ہو کر آگے پیچھے دیکھنے لگتی -

کھلونوں کی ایک دکان پر کھڑے ہو کر اس نے منے کے لیے ایک باجہ خریدا اور اسے اپنے ہونٹوں سے لگا کر بجایا - دکان دار نے مسکرا کر کہا : " آپ تو یہ بہت اچھا بجا لیتی ہیں -" لوتیکا نے ہنس کر باجہ اپنے بٹوے میں رکھ لیا اور دکان دار کو دام دینے لگی - عین اسی وقت اس نے پھر محسوس کیا جیسے کوئی اس کے بہت قریب سے گزر کر نکل گیا ہو - اس نے گھوم کر دیکھا کوئی نہیں تھا - سامنے دو آدمی گاندھی ٹوپی پہنے مزے میں باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے - پھر بھی لوتیکا محتاط ہو گئی - جلسے میں جانے سے پہلے وہ آج اپنے پتی سے ملنا چاہتی تھی جو یہیں کلکتے میں چھپا ہؤا تھا - مگر اب اس نے ایک دم فیصلہ کیا کہ آج وہ اس سے نہیں ملے گی شاید پولیس پیچھا کر رہی ہو اور کہیں وہ اپنی بے وقوفی سے اپنے پتی کی رهائش کا پتا پولیس کو دے دے - تولیکا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا - اس نے دکان سے اُتر کر چور نگاہ سے اُدھر دیکھا جدھر اس کا پتی چھپا ہؤا تھا - پھر اس نے منہ موڑ لیا اور بوؤ بازار کی بس پکڑ لی - فاصلہ یہاں سے زیادہ نہیں تھا اور وہ پیدل ہی جانا چاہتی تھی مگر اس نے سوچا کہ راستے میں کہیں

اس کا دل ڈانوا ڈول نہ ہو جائے۔ اس نے بس پکڑنے ھی میں خیریت سمجھی۔

بس میں اسے نیلما اور پرتبھا مل گئیں۔ نیلما بڑی نازک مزاج ، نفاست پسند لڑکی تھی۔ وہ بہت امیر نہیں تھی ، بہت خوبصورت نہیں تھی ، بہت پڑھی لکھی نہیں تھی پھر بھی اسے دیکھ کر لوگ ھمیشہ اندازہ لگاتے کہ نیلما بہت خوبصورت ھے ، بہت امیر ھے ، بہت پڑھی لکھی ھے۔ دراصل اس کے مزاج میں سلیقے اور سگھڑاپے کو اتنا دخل تھا کہ وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں ، اپنی چھوٹی سی تنخواہ میں ، اپنے چھوٹے سے علم میں اس طرح زندگی بسر کرتی تھی کہ زندگی اپریل کے ابر کی طرح صاف ، شفاف اور چمکتی ھوئی نظر آتی۔ نیلما کو اچھی خوشبوؤں کا بڑا شوق تھا کیونکہ ھسپتال میں اسے اکثر گندی سڑی بدبوؤں سے واسطہ رھتا تھا اور نرس کا کام کرتے کرتے اسے ان بدبوؤں سے چڑ سی بھی ھوگئی تھی۔ اس لیے وہ اکثر شام کو چھٹی کے بعد بڑی تیز خوشبو استعمال کرتی تھی۔ لیکن جب سے اس کا اشتراکی خاوند اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے جیل میں چلا گیا تھا۔ نیلما کو خوشبوؤں سے نفرت سی ھوگئی تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح صاف ستھری ، نفاست پسند لڑکی نظر آتی تھی۔ اب بھی اس کا گھر آئینے کی طرح چمکتا تھا لیکن اب اس کے بالوں میں خوشبو نہیں تھی اسی لیے تو آج لوتیکا اس کے بالوں کی خوشبو سونگھ کر بہت حیران ھوئی۔

لوتیکا نے پوچھا: " کیوں ، کیا ماجرا ھے ؟ پتی مہاشے

سے ملنے جا رہی ہو ؟ "

نیلما مسکرائی : " نہیں پگلی ، میں تو تیرے ساتھ جلسے میں جا رہی ہوں ۔"

اور پرتبھا نے اپنے گول گول گال خود ہی تھپتھپاتے ہوئے کہا : " رام رام ! آج تو جیسے خوشبوؤں کا طوفان اٹھ رہا ہے ۔ چاروں طرف چنبیلی ہی چنبیلی ہے اور لوتیکا نے بھی تو آج غضب ڈھا رکھا ہے ۔ بسنت گھٹائیں باندھ کے آئی ہے اور لال لال گلال چاروں طرف بکھر رہا ہے ۔ سکھیو ! کیا یہ سب جلسے میں جانے کی تیاری ہے ؟ وہاں یہ سندرتا کسے دکھاؤگی ؟"

اتنا کہہ کر پرتبھا زور سے ہنس پڑی ۔ یہ پرتبھا کی خاص عادت تھی کہ خود ہی بات کر کے خود ہی ہنس پڑتی تھی ۔ پرتبھا موٹی موٹی گلگلی سی لڑکی تھی ۔ اس کا اکلوتا بیٹا بھی اپنی ماں کی طرح موٹا موٹا ، گتھلا گتھلا ، بھرا پُرا خوش مزاج نظر آتا تھا لیکن پتی مہاشے بڑے تنک مزاج اور گھمبیر تھے۔ پرتبھا اور اس کے پتی کی صفات ان کے لڑکے میں جمع ہو گئی تھیں ۔ یعنی لڑکا ماں کی طرح موٹا تازہ اور باپ کی طرح گمبھیر ! ذرا سی انگلی دکھانے پر زور زور سے چلانے لگتا ۔ پرتبھا آج اپنے پتی اور اپنے بیٹے دونوں کو گھر میں چھوڑ کر آئی تھی ۔ وہ اب اپنی سہیلیوں سے ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی : " آج گھر میں خوب لطف رہے گا ۔ یہ دونوں حضرت باری باری سے روئیں گے اور ایک دوسرے کے اوپر برتن پھینک کر اپنا جی بہلائیں گے !"

لوتیکا نے فہمائش کرتے ہوئے اس سے کہا : " اس طرح اپنے

گھر کو رکھو گی تو کیسے کام چلے گا ؟"

پرتبھا بولی : " تو کیا کروں سکھی ، مجھ سے تو ایک ھی بار دو دو کام نہیں ھوتے - آج صبح جلسے کے لیے تقریر تیار کر رھی تھی کہ مہاشے چائے مانگنے لگے - چائے دی تو کھانا مانگنے لگے - کھانا کھلایا تو ٹائی مانگنے لگے - کھوئی ھوئی ٹائی ڈھونڈھ کے دی تو اتنے میں لڑکے نے کتے کے منہ میں انگلی دے کر ملہار راگ شروع کر دیا - میں نے کتے کو دھر کے پیٹا تو پتی مہاشے نے شام کلیان شروع کر دیا - اب جب وھاں سے چلی تو دونوں بھیرویں گا رھے تھے - اب تم ھی بتاؤ کیا کروں ؟ "

نیلما نے کہا : " بچے کو کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاؤ -"

پرتبھا نے چمک کر کہا : " کیسے دکھاؤں ؟ کلکتے میں اچھا ڈاکٹر جتنی فیس لیتا ھے اس سے تو ھمارے گھر بھر کا مہینے کا راشن چلتا ھے - تو کیا بی - سی رائے کو بلا کے دکھلاؤں ؟ تم بھی کیسا بورژوا سماج کے لوگوں کی سی باتیں کرتی ھو ، کبھی کبھی - اور پھر یہ تو دیکھو کہ میں کھلاتی کیا ھوں اپنے بیٹے کو اور ان کو -"

اتنا کہہ کر پرتبھا زور سے ھنسی اور پھر بولی : " آج ایک حکیم نے بتلایا ھے کہ انھیں مچھلی میں شلجم پکا کے کھلاؤ تو موٹے ھو جائیں گے - آج ھی بازار سے شلجم خرید کے لائی ھوں ، یہ دیکھو -"

پرتبھا نے اپنے پلو میں بندھے ھوئے شلجم دکھائے اور نیلما اور لوتیکا بے اختیار مسکرا دیں - سچ مچ پرتبھا بڑی بھولی لڑکی

تھی - اس پر غصہ آنا بڑا مشکل تھا - نیلما نے بڑی محبت سے پرتبھا کے کندھے پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا اور لوتیکا نے بھی بڑے پیار سے پرتبھا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا - لوتیکا بھی پرتبھا کو بہت چاہتی تھی کیونکہ پرتبھا مہلا سنگھ میں بہت اچھا کام کر رھی تھی اور تقریر کرنے میں تو کوئی لڑکی اس سے بازی نہیں لے جا سکتی تھی - اور پھر وہ کتنی خوش مزاج لڑکی تھی ، کتنی انتھک کام کرنے والی ، کبھو تو صبح سے شام تک ایک جگہ کھڑی رہے ، کبھو تو صبح سے شام تک چلتی رہے - دھن کی پکی اور غرور تو اسے ُچھو تک نہیں گیا تھا - نہ ھی وہ اپنی ساتھی لڑکیوں سے کسی بات میں جلتی تھی - کیسے ھی مشکل سے مشکل کام اسے دیے گئے، اس نے ھنس کر پورے کر دیے - پرتبھا کی یہ ھنسی اس کے دل سے پھوٹتی تھی اور فوارے کے پانی کی طرح چاروں طرف فضا میں پھیل جاتی تھی - لوتیکا یوں مسکراتی تھی جیسے چاند بدلی میں جھلملائے - پرتبھا یوں جیسے سمندر کی بہتی ھوئی لہر سارے ساحل پر پھیل جائے -

لوتیکا نے آھستہ سے پوچھا : " آج ُتو جلسے میں کیا کہے گی ؟ "

پرتبھا نے بڑی خود اعتمادی سے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ھوئے کہا : " دیدی دیکھتی جاؤ ، آج تمھارے گلے سڑے سماج کے بھس میں وہ چنگاری لگاؤں گی کہ سارا کلکتہ جل اٹھے گا - بس تم اپنی یہ خوبصورت ساری بچا لینا - "

پرتبھا نے یہ کہہ کے زور سے ھنس کر لوتیکا کی پشت پر ھاتھ مارا اور نازک اندام نیلما اس کی اس حرکت پر اپنی نازک

پتلی سی ناک سکیڑ کر اپنی ناخوشی کا اظہار کر رہی تھی کہ اتنے میں بس بوؤ بازار کے نکڑ پر آ کے رک گئی اور یہاں یہ تینوں سہیلیاں اتر کر انڈین ایسوسی ایشن ہال کی جانب چل دیں ۔ اتنے میں دوسری طرف سے ایک اور بس آ کے رکی اور اس میں سے ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی نکلی ، جس کا سجا ہؤا جوڑا ، ریشمی ساری کا زرتار لہریہ اور جھم جھماتا ہؤا بلاؤز دیکھ کے پرتبھا چلا اٹھی : ” اری آسیا.. آسیا...او میری جان آسیا ! آج تو نے کیا غضب ڈھایا ہے ۔ دو بچوں کی ماں ہو کے پھر سے نئی نویلی دلہن کی طرح سجی ہے ! “

آسیا گھوش مسکراتے ہوئے آگے بڑھی ۔ سامنے سے ایک موٹر آ رہی تھی اس لیے رک گئی ۔ پھر موٹر گزر جانے کے بعد اس نے بڑی ادا سے اپنی زرتار ساری سنبھالی اور سرسراتی ہوئی گویا ہوا کی لہروں پر اڑتی ہوئی ، ٹھمکتی ہوئی وہ سڑک پار کر کے پرتبھا ، لوتیکا اور نیلما سے آن ملی ۔ آسیا گھوش بھی مہلا سنگھ کی کارکن تھی اور اس کا پتی سول سکریٹریٹ میں نوکر تھا ۔ اس لیے وہ ہمیشہ اپنی بیوی کو مہلا سنگھ میں کام کرنے سے ، مزدور عورتوں سے ملنے جلنے اور اشتراکیوں کے جلسے میں جانے سے روکتا تھا ۔ اور آسیا گھوش ہنس کر اور کبھی لڑ جھگڑ کر ٹال دیتی تھی ۔ پھر ایک روز مسٹر گھوش بولے : ” سرکار میرے دونوں بچوں کو نوکری نہیں دے گی ۔ اگر تو نہیں مانے گی تو ایک دن میری نوکری بھی اسی طرح چھن جائے گی ۔“ اور جب اس پر بھی آسیا گھوش نہیں مانی تو اتنے خفا ہوئے ، اتنے خفا ہوئے ...

لوتیکا نے جب یہ سنا تو اس کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا - بولی : " اور تُو نے کچھ نہیں کہا ! چپکے سے پٹتی رہی ؟"

آسیا گھوش بولی : " میں نے کیا کہا ، یہ تو جانے دے اس وقت - یہ تو روز روز کی بک بک ، جھک جھک ہے ، ہوتی ہی رہتی ہے - وہ کہتے ہیں ، میں سنتی ہوں -"

نیلما نے آسیا گھوش کی صراحی دار گردن پر ایک لمبی خراش کا نشان دیکھا اور غصے میں بولی : " جنگلی ! دیکھو تو کتنے زور کا ہاتھ مارا ہے ! "

آسیا نے مسکرا کر کہا : " نہیں ، ہاتھ تو اتنے زور کا نہیں پڑا ، وہ ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنے تھے اسی سے یہ جگہ چھل گئی -"

پرتبھا نے پوچھا : " پھر تو آج کیسے آ گئی ؟ "

آسیا گھوش نے کہا : " دیکھتی نہیں ہو کسی کی شادی میں شریک ہونے کے لیے کپڑے پہن رکھے ہیں - دو روز ہوئے میں نے گھر پر ایک فرضی سہیلی کی شادی کا دعوتی رقعہ منگوا لیا تھا - اب کیا پتی دیو سہیلی کی شادی میں شامل ہونے سے بھی روکیں گے ؟ "

پرتبھا اور آسیا ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈال کر زور زور سے ہنسنے لگیں -

انڈین ایسوسی ایشن ہال عورتوں سے بھرا پڑا تھا - دیواروں پر بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے ، جن پر لکھا تھا :

" سیکورٹی ایکٹ کے قیدیوں کو رہا کرو یا ان پر مقدمہ

چلاؤ ـ“

” ھڑتالیوں کی مانگیں پوری کرو ـ“

” سیاسی قیدیوں کے ساتھ انسانوں کا سلوک کرو ـ“

” سیاسی نظر بندوں کو رہا کرو ـ“

” بی ـ سی رائے کا بنگال ٹیگور کا بنگال نہیں ہے ـ“

” ہم مزدور کسان راج چاہتے ہیں ، پولیس راج نہیں چاہتے ـ“

آسیا گھوش بولی : ” ایک بینر یہ بھی چاہیے: ’ پولیس راج اور رام راج میں کیا فرق ہے ؟ ‘ ٹھیک جواب دینے والے کو نوبل پرائز دیا جائے گا ـ“

یہ بات سن کر آس پاس کی بہت سی عورتیں ہنس پڑیں ـ لوتیکا نے نظر دوڑا کے چاروں طرف دیکھا ـ آج کامگار عورتیں خاص طور پر اس جلسے میں زیادہ آئی تھیں ـ سارا ھال کھچا کھچ بھرا ھؤا تھا ـ لوتیکا نے گھڑی دیکھی ـ جلسے کی کارروائی اب تک شروع ھو جانی چاہیے تھی ـ لوتیکا اور پرتبھا کو آتے دیکھ کر اسٹیج پر سے ایک لانبے قد والی بوڑھی مگر پروقار عورت اٹھی اور بے آواز قدموں سے چلتے ھوئے لوتیکا کے پاس آ گئی اور سخت لہجے میں کہنے لگی : ” بہت دیر کر دی !“

لوتیکا معافی مانگنے لگی ـ

بوڑھی عورت نے کہا : ” ہم لوگ تو گھر بھی نہیں گئے ، مل بند ھوتے ھی سیدھے اِدھر آ گئے ـ تمھیں کون سا مل میں جانا تھا ؟ “

لوتیکا اور پرتبھا نے پھر معافی چاہی : ” رضیہ بہن معاف کر دو نا ـ“

رضیہ مسکرائی ، بولی : " چلو اب جلدی سے شروع کر دو ہمیں تمھارا ہی انتظار تھا ۔"

رضیہ صدر چنی گئی ۔ لوتیکا نے اشتراکی نظر بندوں کی مانگوں کو پورا کرنے کا ریزولیوشن پیش کیا اور بڑے جچے تلے الفاظ میں ایک چھوٹی سی تقریر کی ۔ اس کے بعد پرتبھا گھوش نے تجویز کی حمایت کرتے ہوئے آدھے گھنٹے تک جوشیلی تقریر کی اور پرستاؤ تالیوں کی گونج میں پاس کیا گیا ۔

سب عورتیں کھڑی ہو کر تالیاں بجا رہی تھیں اور نعرے لگا رہی تھیں کہ اتنے میں کسی عورت نے رضیہ کے لیے کاغذ کا ایک پرزہ بھیجا ۔ رضیہ نے اس عورت کو اسی وقت اسٹیج پر بلوا لیا ۔ یہ ایک زرد رُو پتلی دبلی عورت تھی جس کے گال اندر پچک گئے تھے ، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور بال الجھ الجھ کر ہوا میں اڑے جا رہے تھے ۔ وہ جلدی جلدی اپنے کالے دوپٹے کا پلو سنبھالتی بھاگتی ہوئی آئی اور دھم سے سٹیج پر آ کے کہنے لگی : " بہنو ، آپ نے یہ پاس کر دیا یہ تو بڑی اچھی بات کی ، پر میں آپ کو ایک بات بتانے یہاں آئی ہوں ۔"

وہ یکایک چپ ہو گئی ۔ ہال میں باتیں بند ہو گئیں ۔ سب اس عورت کی طرف دیکھنے لگے ۔

وہ بولی ، اور اب اس کے لہجے میں گھبراہٹ نہیں تھی : " میرا خاوند ایک کامگار ہے ۔ وہ جوتے کے کارخانے میں کام کرتا ہے ۔ وہ کئی سالوں سے سرخ ساتھی ہے ، کئی ہڑتالوں میں اس نے حصہ لیا ، کانگرسیوں کے ساتھ جیل بھی گیا ۔ خیر

جیل جانا اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے ، جیسے بھوکے رھنا ھم غریبوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے ۔"

وہ چپ ہو گئی ۔ لوتیکا کو ایسے محسوس ھؤا جیسے کسی نے اس کا دل پکڑ لیا ھو ۔ سارے ھال میں سناٹا تھا !

وہ عورت پھر بولی : " لیکن پہلے اپنے نیتا لوگ سرمایہ دار کے خلاف ھڑتال کرنے کو برا نہیں سمجھتے تھے ، میں پوچھتی ھوں وہ اب اسے برا کیوں سمجھتے ھیں ؟ کچھ لوگ آج کل کہتے ھیں کہ سرمایہ دار بھی آخر ھمارے بھائی ھیں ۔ میں کہتی ھوں تو کیا وہ پہلے ھمارے بھائی نہیں تھے ، اب کیا ھؤا ؟ "

مجمع میں سے ایک عورت بول اٹھی : " اب وہ تمھارے بھائی نہیں ھیں اب وہ داماد ھیں داماد !"

اس پر سارا ھال ھنسنے لگا اور تالیاں بجنے لگیں ۔ رضیہ نے مشکل سے چپ کرایا ۔ وہ عورت بڑے غصے میں آ کے کہنے لگی : " بھائی ھوں یا داماد ، وہ پہلے بھی کارخانہ دار تھے ، ھم پہلے بھی مزدور تھے ۔ آج بھی وہ کارخانہ دار ھیں ، ھم آج بھی مزدور ھیں ۔ میرا خاوند پہلے بھی ھڑتال کراتا تھا ، وہ آج بھی کرائے گا ۔ اسے آج یہ حق کیوں نہیں ملتا ھے ؟ آج اسے جیل میں کیوں ٹھونس دیا گیا ھے ؟ اور پھر اس پر کوئی مقدمہ بھی نہیں چلایا جاتا ۔ انگریزوں کے وقت میں اسے دو تین بار سزا ھوئی تھی مگر ھر بار اسے عدالت نے سزا دی تھی ۔ کچھ موٹوں نے جھوٹے سچے بیان دیے تھے ۔ وکیلوں میں بحث ھوئی تھی ۔ اب کیا ھے ؟ نہ وکیل ھیں ، نہ گواہ ھیں ، نہ مقدمہ ھے ، نہ دفعہ ھے ، نہ قانون ھے ، صرف جیل کی سلاخیں ھیں ۔"

وہ عورت ایک لمحے کے بعد پھر بولی : " پچھلے سات دن سے ہمارے گھر راشن نہیں تھا کیونکہ گھر میں اب کوئی کمانے والا نہیں ہے ۔ مجھے دو مہینے سے بار بار بخار آتا تھا اس لیے مل والوں نے مجھے نکال دیا ۔ گھر میں جو کچھ تھا وہ تھوڑا تھوڑا کر کے ہم نے بیچ دیا ۔ پھر میرے پاس تھا ہی کیا ؟ کل رات کو میرا بیٹا بھوک سے بلک بلک کر مر گیا ۔ گھر میں کچھ نہیں تھا ، کئی دن سے نہیں تھا ۔ میں ابھی اپنے بچے کو دفن کر کے آ رہی ہوں ۔ سیدھی یہیں آ رہی ہوں تاکہ اپنا کالا دوپٹہ بہنوں کے سامنے پھیلا کے ان سے پوچھ لوں کیا یہ پرستاؤ کافی ہے ؟ کیا بس یہی تجویز کافی ہے ؟ اگر سچ مچ یہ پرستاؤ کافی ہے تو اس کی ایک نقل مجھے دے دی جائے تاکہ میں اسے اپنے ننھے بیٹے کی قبر پر لگا دوں !"

ہال کا سناٹا ایک دم ٹوٹ گیا جیسے کسی نے بند توڑ دیا ہو ۔ بہت سی آوازیں ایک دم گونجنے لگیں :

" نہیں نہیں ، یہ کافی نہیں ہے ۔ ہرگز ہرگز یہ کافی نہیں ہے ۔"

بہت سی عورتیں کھڑی ہو کر چلا رہی تھیں ۔ اتنے میں ایک نوجوان کامگار عورت جس نے لہنگا پہن رکھا تھا اور جس کی چٹیا غصے کے مارے اِک بپھری ہوئی ناگن کی طرح حرکت کر رہی تھی ، دھم سے سٹیج پر کود گئی اور بانہیں پھیلا کے بولنے لگی : " کافی نہیں ہے تو پھر اُٹھو ، آگے بڑھو ۔ کلکتے کی شیرنیوں ! کیا تم اپنے بھائیوں ، خاوندوں کو جیل میں بھوکا مر جانے دو گی ۔ اُٹھو ! ابھی جلوس نکال کے چلو جیل کی طرف ۔ آج ہم ان کی مانگیں پوری کرا کے واپس آئیں گی ۔"

" ہاں ہاں ، یہ ٹھیک ہے ۔" بہت سی عورتیں اک ہلہ کرنے لگیں ، تالیاں بجنے لگیں ۔ جلوس نکالنے کی تجویز سب کو پسند آئی ۔ چاروں طرف شور اور ہنگامہ بپا ہو گیا ۔ رضیہ کو بڑا غصہ آیا ۔ اس نے زور سے دو تین بار میز پر ہاتھ مار کے عورتوں کو خاموش کیا ۔

ایک عورت بولی : " کامریڈ پریذیڈنٹ ۔"

رضیہ بولی : " تمھاری ایسی تیسی ، چپ رہو ، ورنہ اٹھا کے ہال سے باہر پھینک دوں گی ۔"

دوسری بولی : " مجھے بھی بولنے کا حق ہے ۔"

رضیہ بولی : " تم کون ہو جی ، مہلا سنگھ کی ممبر ہو ۔"

" نہیں نہیں ، میں ممبر نہیں ہوں ۔" وہ عورت بول رہی تھی اور لوتیکا نے دیکھا کہ وہ بھورے رنگ کی بڑی قیمتی ، ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے ہے ۔ ادھیڑ عمر کی موٹی تازی عورت ماتھے پر قم قم سج رہا تھا ، بانہوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں ۔ اسی عورت نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا : " میں ممبر تو نہیں ہوں مگر عام جلسے میں بولنے کا حق مجھے بھی ہے اور خاص طور پر اس لیے بھی مجھے اجازت دی جائے کیونکہ میں آپ کی تجویز کی مخالفت کرنا چاہتی ہوں ۔"

رضیہ نے اٹھ کے کہا : " ایک مہلا اس پرستاؤ کی مخالفت کرنا چاہتی ہیں ۔"

" ہو ، ہو ۔" پھر اک دم شور مچا ۔ دوسرے لمحے میں سارا مجمع اس عورت کی طرف متوجہ ہو گیا جو گردن بڑھائے اسٹیج کی طرف چلی آ رہی تھی ۔

" کیسی مکار لومڑی کی طرح چلتی ہے ۔" ایک عورت زیر۔ لب بولی ۔

دوسری نے کہا : " کیسی چکنی چپڑی نظر آتی ہے ۔"

" خاموش ، خاموش ۔" رضیہ نے گرج کر کہا ۔ اور وہ دونوں عورتیں سہم گئیں اور گردن جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگیں ۔

وہ فربہ اندام عورت اسٹیج پر آ کر کہنے لگی : " بہنو ، مجھے سیاسی قیدیوں اور اشتراکی نظر بندوں کی مانگوں سے پوری پوری ہمدردی ہے ۔ (تالیاں) میں اس پرستاؤ کی پوری پوری تائید کرتی ہوں جو اس سلسلے میں آپ نے منظور کیا ہے ۔ (تالیاں) میں چاہتی ہوں کہ کلکتے کی ہر عورت آج اپنے گھر میں اس پرستاؤ پر بحث کرے لیکن میں اس جلوس کی تجویز کی مخالفت کرتی ہوں کیونکہ آپ کو معلوم نہیں کہ آج کلکتے میں دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے ، قانون توڑ کر ہم قانون کی زد سے بچ نہیں سکتے ۔"

" کون بچنا چاہتا ہے ؟" ایک آواز ہال کے بالکل پیچھے سے آئی ۔"

وہ عورت بولی : " دیکھیے ہم عورتیں ہیں ، ہمیں اپنے گھروں کو دیکھنا ہے ، اپنے بچوں ، اپنے رشتہ داروں کو ، اپنے شوہروں کو دیکھنا ..."

نیلما غصے سے کانپنے لگی ۔ وہ اٹھ کے بولی : " میرا شوہر جیل میں بھوکا مر رہا ہے ۔"

ایک کامگار عورت بول اٹھی : " یہ سونے کی چوڑیاں اتار

کے بات کرو۔"

دوسری نے پوچھا : " بلیک مارکیٹ کا سونا ہے کیا ؟"

تیسری بولی : " اے بہن اس کا پتی ضرور گاندھی ٹوپی پہنتا ہو گا۔"

اس پر بہت سے قہقہے بلند ہوئے اور کالی بھجنگ بڑے بڑے مضبوط ہاتھ پاؤں والی عورت اٹھ کر کہنے لگی : " میں آپ بہنوں سے کہتی ہوں کہ میں اس عورت کے پتی مہاشے کو جانتی ہوں ۔ وہ گاندھی ٹوپی نہیں ، ہیٹ پہنتا ہے ہیٹ ۔"

" تم کیسے جانتی ہو ؟" ایک لڑکی بولی ۔

اس کالی عورت نے اپنے دونوں بازو اپنے کولہوں پر رکھ لیے اور آتش ریز ہو کر بولی : " اس کا خاوند ہمارے محلے میں رہتا ہے ۔ وہ پولیس سب انسپکٹر ہے ، ابھی پچھلے منگل کو اس نے میرے بیٹے کو لال جھنڈے والا سمجھ کر اندر دھر لیا ۔"

" ہائیں !" پرتبھا چلائی ، " یہ پولیس انسپکٹر کی بیوی ہے اور یہاں سی ۔ آئی ۔ ڈی کا کام کرنے آئی ہے ۔ نکل یہاں سے ۔" پرتبھا نے انسپکٹر کی بیوی کو گردن سے پکڑ لیا ۔

منورما نے طنزاً کہا : " جانے دے بہن ، اس بے چاری کو تو سیاسی نظر بندوں سے پوری پوری ہمدردی ہے ۔ یہ تو بس جلوس نکالنے کی مخالفت کرتی ہے ۔"

" اے ہئے ! کیا ہمدردی جتاتی ہے کمبخت نے !" ایک بوڑھی عورت بولی جس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور جس کا سر ہمیشہ آہستہ آہستہ ہلتا رہتا تھا ۔ لوتیکا کو اس کے لب و لہجہ سے ایسا محسوس ہؤا جیسے وہ شمالی ہند

کی رہنے والی ہے۔

اتنے میں مجمعے کی بہت سی عورتیں پولیس انسپکٹر کی بیوی کے گرد جمع ہو گئیں اور قیاس غالب تھا کہ اس کی ٹھکائی بھی ہو جاتی لیکن اس وقت رضیہ نے بڑی عقل مندی سے کام لے کر سب کو ٹھنڈا کیا اور بیچ بچاؤ کر کے اس عورت کو جلسے سے باہر نکالا۔ جب وہ عورت جلسے سے باہر نکالی جا رہی تھی تو بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ اس پریشانی کے عالم میں اس کی ساڑی سے ایک پستول بھی نیچے گر پڑا۔

" اوں ہوں۔" آسیا گھوش نے پستول اٹھا کے کہا : "کمبخت پورا انتظام کر کے آئی تھی نظر بندوں کی حمایت میں۔"

آسیا گھوش اپنے بٹوے میں پستول اس طرح رکھنے لگی جیسے وہ لپ سٹک ہو کہ لوتیکا نے پستول اس سے چھین کر جاسوس عورت کی طرف پھینک دیا اور بولی : " یہ بھی لیتی جاؤ ورنہ پھر کل کلاں کو اپنے اخباروں میں مشہور کرائے گی کہ سیاسی نظر بندوں کی حمائتیوں کی تلاشی پر پستول برآمد ہوئے۔"

جب لوتیکا اور آسیا گھوش انسپکٹر کی بیوی کو جلسے سے نکال کر دور تک پہنچا کے آئیں تو انھوں نے دیکھا کہ بہت سی عورتیں اپنی ساڑیوں کے پلو کس کر باندھ رہی ہیں۔ کچھ عورتیں بینر اٹھا رہی ہیں۔ رضیہ کے ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ ایک جھنڈا اس کالی بھجنگ عورت کے ہاتھ میں تھا جس نے پولیس انسپکٹر کی بیوی کو پہچانا تھا۔ کچھ عورتیں ہال کے کونے میں پڑے ہوئے مٹکے کے پانی سے اپنے پلو بھگو رہی تھیں۔

نیلما بولی : " یہ کس لیے ؟ "

رضیہ نے کہا : " جب آنسو لانے والی گیس چلے گی تو یہ بھیگا ہؤا پلو آنکھوں پر رکھ لینے سے تکلیف کم ہوتی ہے اور آنکھوں کی جلن بہت کم ہو جاتی ہے ۔"

پرتبھا نے پوچھا : " اور اگر گیس نہ چلی ، گولی چلی تو ؟"

آسیا گھوش بولی : " گولی نہیں چلے گی ۔ اگر گولی چلے گی تو میں آگے ہو جاؤں گی اور میرے گہنے پاتے دیکھ کے پولیس والے ضرور یہ سمجھیں گے کہ میں جلوس میں نہیں جا رہی ، منورما کے بیاہ کی بارات میں جا رہی ہوں ۔ کیوں منورما ؟ "

" ہٹ پگلی ! " منورما نے کہا ۔

نیلما کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا ۔ بولی : " گولی چل تو سکتی ہے ۔"

آسیا بھی سنجیدہ ہو کے کہنے لگی : " نہیں چل سکتی ، یہ ٹیگور کا بنگال ہے ۔ یہاں استریوں پر گولی چلانے کی کس میں ہمت ہے ۔"

لوتیکا بولی : " نیلما سکھی تو کیا کھڑے کھڑے سوچ رہی ہے ؟ "

نیلما بولی : " شاید لوتیکا یہ ہماری آخری ملاقات ہے ۔"

لوتیکا بولی : " پگلی ہوئی ہے ؟ میں تو اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہوں ۔"

شمالی ہند کی رہنے والی بوڑھی عورت دروازے پر کھڑی ہو گئی ، جہاں سے عورتیں باہر گزر رہی تھیں ۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ڈبیا تھی جس میں سیندور بھرا تھا ۔ رستہ روک کے کہنے لگی ، اس کا سر آہستہ آہستہ ہل رہا تھا : " میری

بیٹیو ! آؤ میں تمھارے سیندور کا ٹیکہ لگا دوں ، یہ ہماری جیت کا سرخ نشان ہے - آج تمھاری جیت ہو گی بیٹیو !"

لوتیکا نے سر جھکا دیا ، دوسرے لمحے سرخ ٹیکہ اس کے ماتھے پر چمک رہا تھا -

جبینوں پر سرخ ٹیکے چمکنے لگے ، ہوا میں لال جھنڈے کھلتے گئے - یکایک پرتبھا نے انٹرنیشنل شروع کیا -

انٹرنیشنل گاتی ہوئی عورتیں انڈین ایسوسی ایشن ہال سے نکل کے جلوس کی صورت میں بوؤ بازار میں آ گئیں اور چار چار کی قطار باندھ کے کالج سٹریٹ کی طرف بڑھنے لگیں - آگے آگے رضیہ تھی اور وہ کالی بھجنگ عورت - ان کے پیچھے لوتیکا ، نیلما ، پرتبھا ، منورما ، گیتا سرکار اور آمیا گھوش ان کے پیچھے آ رہی تھیں - لوتیکا نے ایک نگاہ پیچھے ڈال کے دیکھا : جلوس بڑی باقاعدگی اور ترتیب سے آگے بڑھ رہا تھا اور اس کے انقلابی نعرے گونج رہے تھے - لوتیکا نے دیکھا کہ بازار کی عام فضا میں جیسے بجلی سنسنا گئی ہو - کچھ لوگوں میں ہراس پھیل گیا اور وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے - بہت سے لوگوں نے عورتوں کی ہمت کی داد دینی شروع کی ، جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر دفعہ ۱۴۴ کے ہوتے ہوئے جلوس نکال کر بھوک ہڑتالیوں سے اپنی ہمدردی ظاہر کی - بہت سے امیر دکان دار اپنی دکانیں بند کرنے لگے - کچھ راہ گیر سڑک چھوڑ کر تنگ گلیوں میں گھستے گئے ، کچھ جلوس کے ساتھ آتے گئے - بوؤ بازار کے اونچے بالا خانوں میں چند عورتیں میک اپ کیے ہنس رہی تھیں - ایک

ٹرام بجلی کا تاڑ رگڑتی ہوئی آگے نکل گئی - لوتیکا چلتے چلتے دیر تک اس بجلی کے تار کو دیکھتی رہی - یکایک چوراہے پر اس تار سے ایک شعلہ پیدا ہؤا اور وہ کانپ گئی - فضا اس وقت بالکل نقلی سی معلوم ہو رہی تھی - قدم آگے بڑھ رہے تھے - زبان پر گیت کے جوشیلے مصرعے تھے لیکن ان مصرعوں کے اندر اور باہر جیسے انھیں کاٹتے ہوئے ان کے آگے پیچھے جھانکتے ہوئے کئی خیال آتے جاتے ایک دوسرے سے ٹکرا کر گڈمڈ ہوتے جا رہے تھے - چاچی کے چہرے پر ایک بھورے رنگ کا مسّا کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے... میں آج اپنے پتی سے کیوں نہیں ملی... ٹرام کا تار کیسے بھاگتا جا رہا ہے... نیلما کی ناک... میں آج اپنے پتی سے مل آتی تو اچھا ہوتا.... گولی چل سکتی ہے... نہیں چل سکتی ، نہیں چل سکتی... وہ جیپ آ رہی ہے ! اور لوتیکا کے خیال جیپ سے چپک گئے - اب اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا - سامنے سے جیپ آ رہی تھی - جیپ کے اوپر لاسلکی کا آلہ لگا ہؤا تھا اور جیپ میں پولیس بیٹھی ہوئی تھی - اور جلوس آگے بڑھ رہا تھا اور سامنے سے جیپ آ رہی تھی اور قریب آتی جا رہی تھی اور جیپ میں پولیس کے سپاہی تھے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور جیپ آگے بڑھ رہی تھی اور مجمع آگے بڑھ رہا تھا - لوتیکا کے سارے خیالات ، اس کا ذہن ، اس کا دل و دماغ اور حواس سب اس جیپ سے چپک گئے تھے - یکایک جیپ مجمعے سے کچھ دور رک گئی اور لوتیکا کو ایک دھچکا سا لگا اور یکایک اسے خیال آیا کہ میں نے آج منے کی نیکر دھلنے کے لیے نہیں دی اور پھر جیسے اس کے آگے لوتیکا کو کچھ یاد نہ رہا -

جیسے ذہن پر سے کانچ کی شفاف سطح چھن سے ٹوٹ گئی اور اب وہ اس ٹوٹے ہوئے کانچ کے سوراخ سے باہر دیکھ رہی تھی ۔

پولیس نے جلوس کا راستہ روک لیا تھا اور ایک افسر کہہ رہا تھا : " جلوس آگے نہیں جائے گا ۔"

لوتیکا کے قدم آپ ہی آپ آگے بڑھ گئے ۔

قدم نہیں رکے ، جھنڈے نہیں رکے ۔

" شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے ، جلوس نکالنا خلاف قانون ہے ۔"

بھوک ہڑتالی لوہے کی سلاخوں کے پیچھے سے جھانک رہے تھے ۔ عورتوں کے قدم آگے بڑھ گئے ۔

" میں حکم دیتا ہوں ، یہ جلوس منتشر ہو جائے !"

لوتیکا کو یہ حکم بڑا سطحی سا معلوم ہؤا جیسے دور طاق پر رکھا ہؤا کوئی کھلونا بول رہا ہو ۔

جلوس آگے بڑھتا گیا ۔ سرخ سیندور کے ٹیکے قطار اندر قطار ۔

" منتشر ہو جاؤ ! ایک دم !!"

ایک دم لوتیکا کے ذہن کے دریچے میں دو آنکھیں چمکنے لگیں اور موہوم سا چہرہ ۔

یہ کس کی آنکھیں تھیں ؟ یہ کس کا چہرہ تھا ؟ ہاں ! یہ اس کے پتی کا چہرہ تھا ۔

سیڑھیوں پر منا کھڑا تھا ۔ پتلا پتلا کانچ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا ۔

یکایک لوتیکا کو ایسا محسوس ہؤا جیسے کوئی چنگاری اس کے پیٹ میں گھستی چلی گئی ہے ۔ ٹرام کے بجلی کے تار کی طرح

اور وہ کراہ کے نیچے گر پڑی - منا سیڑھیوں سے نیچے گر پڑا اور پھر اچانک اندھیرا چھا گیا ، بیچ میں ایک روشنی کی کرن سی تڑپی ، آدھا خیال ، ایک چوتھائی خیال ، دو آنکھیں ، ایک چہرہ ، پھر اندھیرا -

تڑاخ ، تڑاخ ، تڑاخ -

گولی چل رہی تھی -

رضیہ نے گرج کر کہا : " زمین پر لیٹ جاؤ -"

گولی سنسناتی ہوئی رضیہ کے پاس سے نکل گئی - رضیہ زمین پر لیٹ گئی -

سارا مجمع زمین پر لیٹ گیا - بالا خانوں کے دریچے زور زور سے بند ہونے لگے - چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں ، پھر ایک دم سناٹا چھا گیا - ہوا میں صرف گولیوں کی آواز سنسناتی ہوئی معلوم ہوتی تھی -

نیلما گردن جھکائے زمین کے ساتھ لگی اپنی آنکھوں ، ماتھے اور کانوں کو ہاتھوں سے ڈھانپے گلی کے کونے کی طرف گھسٹ رہی تھی - اس کا ہاتھ آسیا گھوش کے ہاتھ میں تھا - وہ ہاتھ پہلے چل رہا تھا پھر رک گیا - وہ ہاتھ پہلے گرم تھا پھر سرد پڑ گیا - نیلما نے ہاتھ چھوڑ دیا - کسی کی بارات گزر گئی - آسیا ، نیلما آگے گھسٹنے لگی - آگے جا کے وہ پھسل گئی اور اس کے دونوں ہاتھ کسی کے خون میں تر بتر ہو گئے - نیلما نے ہلکی سی چیخ مار کے دیکھا پرتبھا مری پڑی تھی اور اس کے پلو میں بندھے ہوئے شلجم نکل کر لہو میں بھیگے ہوئے تھے - شلجم اور مچھلی کا شوربہ ، پرتبھا 'تو آج اپنے پتی مہاشے کو کیا کھلائے

گی ؟ نیلما آگے گھسٹنے لگی - ایک گولی زن سے آئی اور کوئی اس کے پیچھے زور سے چیخا - ایک لمحے کی لمبی چیخ جہاں زندگی ختم ہوتی ہے اور موت شروع ہوتی ہے - یہ گیتا سرکار تھی - گولی اس کے بھیجے کو چیر کر پار ہو گئی تھی - قریب ہی ایک نوجوان لڑکا مرا پڑا تھا - پالش کی ڈبیہ اور برش اس کے ہاتھ میں تھا - یکایک نیلما کے دانت بجنے لگے اور اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں - رضیہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی :
" کیا ہے ؟ " اس نے پوچھا ، " تمہیں کہاں چوٹ آئی ہے ؟"

نیلما گھبرا کے اٹھی - مجمع چھٹ گیا تھا - کچھ لاشیں زمین پر پڑی تھیں ، کچھ لوگ کراہ رہے تھے ، کئیوں نے نالیوں کے قریب یا دکانوں کے زینوں کے نیچے پناہ لی تھی -

پولیس والے اب ہٹ کے ذرا دور کھڑے تھے- سارے بازار میں سناٹا تھا -

نیلما نے پوچھا : " کیا ہؤا ؟ "

رضیہ بولی : " اب سب کچھ ہو چکا ، چلو لوتیکا کے پاس -"

نیلما نے اپنے آپ کو دیکھا ، اسے کہیں چوٹ نہیں آئی - اس پر وہ بڑی حیران سی ہوگئی - رضیہ کی بانہہ سے ایک گولی چھچھلتی ہوئی گزر گئی تھی -

رضیہ اور نیلما لوتیکا کے پاس پہنچیں جو دھیمے دھیمے لہجے میں پڑی کراہ رہی تھی - اس کے پاس ہی منورما اوندھے منہ پڑی تھی ، اپنے ہاتھ کانوں میں دیے -

نیلما نے کہا : " اٹھو منورما اٹھو - دیکھو لوتیکا کراہ رہی ہے - آؤ اسے اٹھا کے لے چلیں -"

رضیہ نے کہا: "کسے اٹھاتی ہو؟ منورما تو اب نہیں اٹھے گی۔ اب تو وہ کسی کی نہیں سنے گی۔"

نیلما نے آہستہ سے منورما کے ہاتھ اس کے کانوں سے الگ کیے۔ ایک کرن پھول اس کے کان سے الگ ہو کے نیلما کے ہاتھ میں آ گیا۔ منورما سچ مچ سو رہی تھی۔ اس کے سینے میں ایک گہرا شگاف تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں، اس کے ہونٹ خاموش تھے اور اس کی کنواری چھاتیوں میں کسی نے مامتا کے سوتے خشک کر دیے تھے۔

"ہائے! ہائے!" لوتیکا آہستہ سے کراہی۔

رضیہ اور نیلما نے چاروں طرف دیکھا: سناٹا، جمود...اور ہیبت ناک خاموشی، جیسے کائنات نے اپنا سانس روک لیا ہو اور زمین نے اپنے محور کا طواف چھوڑ دیا ہو۔

جوتوں کی ایک دکان کے اوپر بالا خانے میں سے ایک بڈھا چینی نیچے جھانک رہا تھا۔ رضیہ نے اسے نیچے آنے کے لیے اشارہ کیا۔ بڈھے چینی نے غور سے نیچے دیکھا، اس کی دکان تو بند تھی۔ وہ اندر سے ہو کے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ بالا خانے سے سڑک تک آنے کے لیے ایک زینہ ضرور تھا لیکن یہ زینہ باہر دیوار سے لگا تھا اور دیوار ننگی تھی اور پولیس والوں کی زد میں تھی۔ کہیں کوئی پناہ نہ تھی۔

بڈھا چینی زینے سے گھسٹتا گھسٹتا مکڑی کی طرح لگا لگا دیوار ٹٹولتا نیچے اتر آیا۔ نیچے اتر کر اس نے جلدی سے دکان کھولی اور پھر نیلما اور رضیہ کی مدد سے وہ لوتیکا کو اٹھا کر دکان کے اندر لے آیا۔

سپاہی دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے -

بوؤ بازار کے بالا خانوں کے اونچے دریچوں میں عورتیں کھڑی کھڑی رونے لگیں -

مجمع آہستہ آہستہ پھر بیدار ہونے لگا - عورتیں فرش خاک سے اٹھ کے زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے لگیں اور اپنے ساتھ کی لاشیں دیکھنے لگیں -

گیتا سرکار

میں گیتا سرکار ہوں - میری عمر اٹھارہ برس کی ہے - میرے ماں باپ بہت غریب ہیں اس لیے مجھے معلوم ہے غریبی کیا ہوتی ہے - میں آرجی کار مائیکل کالج میں ایک نرس ہوں - مجھے ایک لڑکے سے محبت ہے ، اس کا نام اجیت بوس ہے - وہ اگلے سال ڈاکٹری کا امتحان پاس کر لے گا ، پھر ہم دونوں کی شادی ہو جائے گی - تڑاخ !

اُمیا گھوش

میں ہنسنے والی رنگیلی چڑیا ہوں جو ساون کے بادلوں میں اُڑتی ہے اور آکاش کی نیلی جھیل کے سپنے دیکھتی ہے اور رات کو اپنے چھوٹے سے گھونسلے میں بیٹھ کر اپنے دونوں بچوں کو دائیں بائیں سلا کر اپنی بانہیں پھیلا کے سو جاتی ہے - بچے کتنے پیارے ہوتے ہیں ! گھونسلا کتنا آرام دہ ہوتا ہے ! آج میں اپنے دونوں بچوں کو ایک عمدہ سی کہانی سناؤں گی اور وہ میرے نرم گرم سینے سے لگے کس طرح اپنی معصوم آنکھیں کھولے میری کہانی سنیں گے اور کہانی سنتے سنتے سو جائیں گے - تڑاخ !

منورما

میں جلسے سے فارغ ہو کر تمہیں چھ بجے اوڈین سینما کے باہر ملوں گی ۔ نہیں ہم تیرنے والی ننگی عورتوں کی رنگین فلم نہیں دیکھیں گے ۔ ہم چارلی چپلن کی فلم دیکھیں گے جو رحم اور ترس اور نیکی کا فرشتہ ہے اور اگلے ہفتے جب ہماری شادی ہو جائے گی تو ہم پھر یہی فلم دیکھیں گے اور اسے دیکھ کر بردوان جائیں گے جہاں تمہارا گھر ہے ۔ جس کے آنگن میں تلسی کا پودا ہے اور پنجتارے کا پیڑ ہے ۔ وہاں ہم چاندنی راتوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے گھنٹوں چپ چاپ بیٹھے رہیں گے اور اس آنے والے بچے کا تصور کریں گے جس کی خوشبو میں تلسی کا پودا مہکتا ہے ۔ میں جلسے سے فارغ ہو کے چھ بجے تک ضرور اوڈین سینما کے دروازے پر پہنچ جاؤں گی ۔ میرا انتظار کرنا ۔

تڑاخ !

پرتبھا گنگولی

گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے ۔

یہ ہم دونوں کا بیٹا ہے ۔ ہم دونوں غریب ہیں ۔ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکے ، لیکن اس بیٹے کا مستقبل بڑا امیر ہے کیونکہ یہ اس زمانے کا بیٹا ہے جو ہماری امیدوں کی کرن ہے ۔ وہ لرزتی ہوئی خوشی کی کرن سامنے سے آ رہی ہے... گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے ۔

تڑاخ !

پالش والا

میرا کوئی نام نہیں ہے ۔ میرے باپ کا کوئی نام نہیں ہے ۔

میری ماں کا کوئی نام نہیں ہے ۔ میں کلکتے کی تاریک گلیوں کی پیداوار ہوں ۔ میں غریبی اور سرمایہ داری کے آتشک کی اولاد ہوں ۔ یہ آتشک آج بھی کلکتے کی روح کو ایک جونک کی طرح چوس رہی ہے ۔ میں بوٹ پالش کرتا ہوں ۔ لوگ چہرے چمکاتے ہیں ، میں بوٹ چمکاتا ہوں ۔ لوگ چہرے پڑھتے ہیں ، میں بوٹ پڑھتا ہوں ۔ میں ٹھوکروں میں رہتا ہوں ۔ فٹ پاتھ پر سوتا ہوں اور ہوٹلوں کا جھوٹا کھانا کھاتا ہوں ۔

میرا کوئی نام نہیں ہے ۔ میں دراصل یونہی ان لڑکیوں کو بچانے آ گیا ورنہ مجھے اس جلوس کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ کیا ہے ، کدھر جا رہا ہے ۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ جب عورت پر گولی چلتی ہے تو مرد سامنے آ جاتا ہے کیونکہ عورت مرد کی ماں ہے اور ماں کو بچانا ہر بیٹے کا فرض ہے ، چاہے اس بیٹے کو کوئی ماں اپنا بیٹا کہہ کے نہ پکارے ۔

میرا کوئی نام نہیں ہے ۔ میں شاید وہ معمولی بے نام شاعر ہوں جو ہر صدی میں ظلم کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا ہے ۔ میں شاید وہ گمنام سپاہی ہوں جو ہر محاذ پر ، ہر مورچے پر ، ہر میدان جنگ میں شہید ہوا ہے ۔ میں شاید وہ علمبردار ہوں جس کے فرشتوں کی طرح نیک اور محنتی ہاتھوں میں انقلاب کا پرچم لہراتا ہے ۔

میرا کوئی نام نہیں ہے ، میں شاید یہاں اپنی ماں کو ڈھونڈھنے آیا تھا ۔ تڑاخ !

چینی بڈھے کی دکان میں نیلما نے لوتیکا کا سر اپنی گود میں

لے کر پوچھا : " اب کیسی ہو لوتیکا ؟ "

لوتیکا کے چہرے پر چاچی ایسی مسکراہٹ آئی ، بولی : " اچھی ہوں ، پیٹ میں معمولی سا درد ہے ۔"

رضیہ نے کہا : " ابھی ایمبولنس آتی ہو گی ۔ بڈھے چینی نے ، خدا اس کا بھلا کرے ، ابھی ایمبولنس کے لیے ٹیلیفون کیا ہے ۔"

بڈھا چینی اتنے میں دکان کے اندر سے تھوڑی سی روئی لے کر آیا ۔ بولا : " اس روئی کو پیٹ پر رکھ دو ۔"

رضیہ بولی : " اس سے کیا ہو گا ؟ "

بڈھا ہاتھ ملتے ہوئے بولا : " اس سے کچھ نہیں ہو گا مگر کیا کروں ، کیا کروں... کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔"

رضیہ بولی : " چپکے بیٹھے رہو ، ایمبولنس آتی ہو گی ۔"

بڈھا تھوڑی دیر کے لیے چپ رہا پھر کہنے لگا ، " یہ چیانگ ...یہ سب اسی چیانگ کی بدمعاشی ہے ، میں سب جانتا ہوں ۔"

رضیہ نے کہا : " کیسے باؤلوں کی سی باتیں کر رہے ہو ، یہاں کہاں تمھارا چیانگ آ گیا ؟ "

بڈھا چینی ہاتھ ملتے ہوئے بولا : " وہی ہو گا ، وہی ہو گا ! تم نہیں جانتیں ، میں ساری دنیا گھوما ہوں ، ہر ملک میں چیانگ ہے ۔ چھوٹا چیانگ ، پھر اس سے بڑا چیانگ ، پھر اس سے بھی بہت بڑا چیانگ ۔ چینی بڈھے نے ہاتھ پھیلا کے بہت بڑے چیانگ کی جسامت بیان کرتے ہوئے کہا ، " اور یہ سب چیانگ مل کے ہم کو لوٹتے ہیں ، ہم پر گولی چلاتے ہیں ۔"

بڈھا چپ ہو گیا ۔ لوتیکا ہولے ہولے کراہتی رہی... کان میں کلاک ٹک ٹک کرتا رہا ۔

بڈھا پھر بولا : " ان تمام چیانگوں کو ختم کرنا ہوگا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے ۔ صرف پی پنگ کا راستہ ہے جہاں ہماری فوجیں خوشی کے شادیانے بجاتی ہوئی داخل ہوئی ہیں ۔"
یہ کہتے کہتے بڈھے کے مغموم چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ پی پنگ کا نام سن کے لوتیکا کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ سی آئی ۔ بولی : " اب کتنی دیر ہے ؟ "

رضیہ بولی : " آ رہی ہے ، لو وہ آ گئی !"

ایک ایمبولنس دکان کے سامنے آ کے رکی ۔ رضیہ نے کہا : " لوتیکا تم گھبراؤ نہیں ، اب تم بچ جاؤ گی ۔"

لوتیکا نے بڑے اطمینان سے کہا : " ہاں ، میں جانتی ہوں میں نہیں مروں گی ۔"

ایمبولنس لوتیکا کو لے کے چل دی ۔

رضیہ نے گرا ہؤا جھنڈا آٹھا لیا ۔ یہ جھنڈا اتنا لال کس لیے تھا ؟ کیوں چمک رہا تھا ؟ اس چمک میں اتنا بھرپور غصہ کیوں تھا ؟ اس کالی بھجنگ عورت نے آسیا گھوش کو اپنے کندھے پر آٹھا لیا ۔ چار مزدور عورتوں نے اس نوجوان لڑکے کی لاش کو اپنے ہاتھوں میں آٹھا لیا ۔ باقی لاشیں بھی مجمعے نے آٹھا لیں ۔ آہستہ آہستہ جلوس پھر آگے بڑھنے لگا ۔ دکانیں کھلتی گئیں ، لوگ غصے میں باتیں کرنے لگے ۔ جلوس بڑھتا گیا اور بڑا ہوتا گیا ۔ جھنڈا ہوا میں کھلتا گیا جیسے کلکتے کی زندانی روح اپنی بیڑیاں کاٹ کے اس جلوس میں شامل ہو رہی ہو ۔ لوگ ہا گ ، دس ، بارہ ، پندرہ ، بیس ، سو ، ہزار ہزار کی گنتی

میں آ کے اس جلوس میں ملتے گئے اور جوشیلے نعرے ، نفرت اور غصے کے بھرے ہوئے نعرے لگاتے گئے ۔ اب کسی کو گولی کا ، دفعہ ۱۴۴ کا ڈر نہیں رہا ۔ عورتوں نے شہیدوں کا لہو اپنے ماتھے پر لگا لیا اور سینہ تان کے آگے بڑھنے لگیں اور پولیس کے سپاہی پیچھے ہٹنے لگے۔ جلوس آگے بڑھتا گیا ، کلکتے کے بازاروں میں ، کلکتے کی گلیوں میں ، کلکتے کے کوچوں میں ، لوگ سینما گھروں میں سے نکل آئے ، کارخانوں میں سے نکل آئے۔ کلرک ، طالب علم ، دکان دار ، تماشائی مزدوروں کی رہنمائی میں آگے بڑھتے گئے۔ جلوس آگے بڑھتا گیا ، جیل خانے کی طرف ۔ اب جنتا باہر نکل آئی تھی اور ظالم زمین کے نیچے خندقوں میں چھپ گئے تھے ۔

ایمبولنس بھاگی جا رہی تھی ، اس کا بھونپو زور سے بار بار جھلاہٹ سے چلاتا اور ہر بار لوتیکا کو اس آواز سے اذیت ناک تکلیف ہوتی ۔ یہ شور کس لیے ہے ؟ یہ میرے پیٹ میں یکایک ہزاروں گولیاں سی کیوں چلنے لگی ہیں ۔ یہ شعلے کیوں رگ رگ اور نس نس میں بھڑک رہے ہیں ، یہ کرب ناک نشتر زنی کیوں ہے ؟ جیسے جسم کا ہر حصہ گودے ڈالتا ہو ۔ درد کی لہریں پیٹ میں اٹھتی ہیں ، گھومتی ہیں ۔ بھنور ، دائرے ، آگ کے شعلے ، بھونچال ، جلتا ہؤا لاوا ۔ میرے رام ! کیا موت اسی کو کہتے ہیں ، جیسے جسم کے ذرے ذرے میں چھالے ابل آئیں ؟

ایمبولنس بھاگی جا رہی تھی ، اس کی آہنی جالیوں کے باہر زندگی

تھی - لوتیکا نے حسرت بھری نگاہوں سے باہر جھانکا - ایمبولنس ایک پانچ منزلہ عمارت کے سامنے سے گزر رہی تھی - لوتیکا نے دیکھا کھڑکیوں میں رنگین پردے لہرا رہے تھے ، دو لڑکے سگریٹ پیتے ہوئے بالکونی پر جھکے ہوئے ہنس رہے تھے ، ایک درزی گلابی ساٹن کا بلاؤز سی رہا ہے ، بوڑھی مائی تھیلے میں راشن لیے جا رہی ہے ، ایک آدمی کوئلے کی بوری اٹھا رہا ہے ، ماں بچے کو لیے کھڑکی میں کھڑی ہے ، بچہ ہمکتا ہے اور مسکرا دیتا ہے ، اوپر آسمان گہرا نیلا ہے — لوتیکا نے آنکھیں بند کر لیں ، جیسے اس کے مرتے ہوئے جسم اور روح کو قرار آ گیا اور اس کے دل میں امن اور سکون اور شانتی کے گھنٹے بجنے لگے : موت کچھ نہیں ہے ، زندگی ہی سب کچھ ہے - موت کچھ نہیں ، زندگی ہی سب کچھ ہے - موت کچھ نہیں ہے ، بچے کی مسکراہٹ ہی سب کچھ ہے - اس ایک لمحے میں لوتیکا دور کھڑکی میں کھڑی ماں کی گود سے ، جیسے بچے کو اپنی گود میں لیا اور اسے چوم کر اسی لمحے میں اس کی ماں کے حوالے کر دیا - زندگی سے موت اور موت سے پھر زندگی کی طرف -

لوتیکا سین اپنی زندگی کے آخری لمحے میں بھی صبح کے پہلے اجالے کی طرح مسکرائی -

مورگ -

مورگ میں چھ لاشیں پڑی تھیں :

۱ - لوتیکا سین - ۲ - آمیا گھوش - ۳ - پرتبھا گنگولی

۴ - گیتا سرکار - ۵ - منورما - ۶ - ایک بے نام لڑکا -

یہ چھ کی چھ کی لاشیں مورگ میں ننگی پڑی تھیں - ان کے

جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا اور مورگ کے ملازم ، انسان نما چیل اور گدھ جو سڑے ہوئے سماج کے اندر سڑے ہوئے گوشت اور پوست کی تجارت کرتے ہیں ، ان لاشوں کے متعلق اپنے مخصوص گندے گھناؤنے انداز میں باتیں کر رہے تھے ، مذاق کر رہے تھے ، انھیں اپنی غلیظ تضحیک کا نشانہ بنا رہے تھے :

" سالی اچھی ہے !"

" کیسی گول گول اور گلگلی ہے !"

" ذرا اس کا جسم تو دیکھو لونڈیا ہے !"

" اس کا گوشت ابھی تک گرم اور نرم ہے ۔"

نیلما نے جو اب اپنی نرس کی ڈیوٹی پر واپس آ گئی تھی ۔ نگاہ اوپر اٹھا کے دیکھا : آسمان ننگا تھا ، دھرتی ننگی تھی ، آفتاب کی کرنیں ننگی تھیں اور سیتا اور ساوتری کے جسم ننگے تھے اور مورگ سے بہت دور کہیں ہزاروں میل پر والڈ روف ایسٹوریا ہوٹل کے شاندار لاؤنج میں مسز وجے لکشمی پنڈت کہہ رہی تھیں : " ہندوستان میں کمیونزم کبھی نہیں آ سکتا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کی مرکزی کونسل میں اشترا کیوں کا ایک بھی نمائندہ نہیں ہے ۔" اشترا کیوں کے نمائندے بے شک مرکزی کونسل میں نہیں ہیں لیکن وہ یہاں کلکتے کی مورگ میں ضرور موجود ہیں ۔ کلکتے کی جیلوں میں قید میں پھانسی کے تختے پر لٹک رہے ہیں ۔ والڈ روف ایسٹوریا ہوٹل کا امریکی فوائر بہت خوبصورت ہے لیکن ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ اب یہ ہوٹل اور کوٹھیاں نہیں کریں گی ۔ نیلما نے سوچا آج ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کلکتے کی مورگ میں ہو رہا ہے ۔ کلکتے کی

جیلوں میں ہو رہا ہے ، کلکتے کی سڑکوں پر ہو رہا ہے ۔ اس وقت نیلما کا جی چاہا کہ وہ ہزار میل دور بیٹھی ہوئی مسز پنڈت کو پکا رپکار کر کہے : " آؤ اور دیکھو کہ ہندوستان کی اس کھلی مرکزی اسمبلی میں جو ہندوستان کی سڑکوں ، ملوں ، چالوں اور آنگنوں میں منعقد ہو رہی ہے ۔ اشتراکیوں کا کوئی نمائندہ موجود ہے کہ نہیں !"

نیلما نے ان پانچوں لاشوں کی طرف پھر دیکھا :

مقدس اور ننگی لاشیں ، جیسے اجول جوالا ، بھڑکتا ہؤا ننگا شعلۂ ، تخلیق کی تڑپتی ہوئی بجلی ! جیسے انقلاب اپنے خون سے ہنس دے اور جلتے ہوئے ، سلگتے ہوئے انگارے پھول بن جائیں ۔

بہت دیر تک یہ لاشیں ننگی پڑی رہیں ۔

بہت دیر تک مورگ کے بے حس ملازم مذاق کرتے رہے ۔

بہت دیر تک نیلما ، نیلما عورت اور نیلما اس ہسپتال کی نرس مورگ کے ملازمین سے ان لاشوں کو ڈھک دینے کے لیے کہتی رہی ۔

بہت دیر تک وہ لوگ مذاق آڑاتے رہے ، اور مذاق ہی مذاق میں بات کو ٹالتے رہے ۔

نیلما ، نازک مزاج ، نفاست پسند نیلما کا چہرہ یکایک غصے سے سرخ ہوگیا ۔ اس کی مٹھیاں تن گئیں اور اس نے بے دھڑک دونوں ہاتھوں سے اپنی ساری کھول ڈالی اور آسے ان لاشوں پر ڈال دیا ۔

اب وہ سب کے سامنے ننگی کھڑی تھی لیکن کس میں ہمت تھی جو اس وقت اس سے آنکھ ملا سکے ۔ وہ اس وقت شوجی

کی تیسری آنکھ تھی جسے دیکھتی بھسم کر ڈالتی ۔ ایک ایک کر کے مورگ کے سارے ملازم وہاں سے کھسک گئے ۔ پولیس کے سپاہی بھی شرمندہ ہو کے وہاں سے چلے گئے ۔ اب وہاں کوئی نہ تھا ۔ صرف نیلما شہیدوں کی لاشوں پر پہرہ دے رہی تھی ۔

اتنے میں کچھ لوگ سفید چادریں لے آئے ۔

رات بہت گہری ہو چکی تھی لیکن آج کلکتہ سویا نہ تھا ۔ لوگ گلیوں اور بازاروں میں غصے اور رنج سے مغلوب ہو کے گھوم رہے تھے ، کہیں فرار نہ تھا ، کوئی اس شدید غصے اور نفرت کے جذبے سے بھاگ کر کہیں پناہ نہ لے سکتا تھا ۔ سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے تضاد نے دھوکے اور خود فریبی کے سارے راستے مسدود کر دیے تھے ۔ نیلما تیز تیز قدموں سے گزرتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہی تھی اور دیکھ رہی تھی کہ آج کلکتے کے لوگ پاگل ہو کے اپنی بے چین مٹھیوں کو بار بار بھینچتے ہیں اور انقلابی گیت گاتے ہوئے گلی کوچوں میں عوام کے دشمنوں کو ڈھونڈ رہے ہیں ۔

چاچی کتنے عرصے سے بالکونی پر کھڑی برہم پترا کے چڑھتے ہوئے پانی کو دیکھ رہی تھیں ۔ منا ابھی تک سویا نہ تھا ۔ وہ بھی آج بے قرار تھا ، بے چین تھا اور اسے معلوم نہیں تھا کہ کون سی چیز ہے جو اسے یوں بے چین کر رہی ہے ۔ گلیوں اور کوچوں اور بازاروں میں نعرے گونج رہے تھے ۔ کبھی کہیں کوئی دھماکا ہوتا اور کبھی کہیں زور کی چیخیں سنائی دیتیں ۔

تیز تیز قدموں سے بھاگنے کی آواز آتی اور پھر نعروں کے طوفان کے بعد یک لخت سناٹا سا چھا جاتا -

ایک ایسے ھی سناٹے کے وقفے میں نیلما لوتیکا کے گھر میں داخل ھوئی - چاچی نے سیڑھیوں کی بتی روشن کی اور نیلما کو دیکھتے ھی اس کے چہرے کو پڑھ لیا کیونکہ چاچی نے زندگی میں آنسو ھی بوئے تھے اور آنسو ھی کاٹے تھے اور وہ اس فصل کو اچھی طرح پہچانتی تھی -

نیلما چاچی کو الگ لے جا کر کچھ بات کرنے لگی - چاچی نے اسے ھاتھ کے اشارے سے روک دیا - کہنے لگیں : " کچھ نہ کہو ، تمھارے چہرے نے مجھے سب کچھ بتا دیا ھے - یہ بتاؤ وہ اس وقت ھے کہاں ؟"

نیلما نے رندھے گلے سے کہا : " شہر سے آٹھ دس میل دور ایک پرانے گھاٹ کی چتا میں -"

چاچی کی آنکھوں کی مغموم پتلیاں ایک لحظہ کے لیے زور سے کانپیں پھر ایک دم ساکت ھو گئیں - انھوں نے سیڑھیوں کے جنگلے کو زور سے پکڑ لیا -

منے نے پوچھا : " ماں کہاں ھے ؟ "

نیلما نے کہا : " ماں نہیں آئے گی ؟ "

منے نے پوچھا : " ماں کیوں نہیں آئے گی ؟ "

نیلما نے بڑی مشکل سے کہا : " ماں بہت دور چلی گئی ھے -"

چاچی روتے روتے بولیں : " کہاں ھو تم مہا کوی ٹھاکر ؟ تم نے ننھا چاند لکھا تھا جس میں بچے کھو جاتے ھیں اور مائیں انھیں جوھی کے پھولوں میں تلاش کرتی ھیں - آج کلکتے میں

مائیں جوھی کے پھول بن گئی ھیں اور ننھے ننھے بچے انھیں کلکتے کی گلیوں میں ڈھونڈ رھے ھیں ۔ کہاں ھو تم سہا کوی ٹھا کر؟"

منا آھستہ سے چاچی کے پاس چلا گیا ۔ بولا ، " چاچی تو روتی کیوں ھے ؟ میں جانتا ھوں ماں کہاں گئی ھیں ۔"

" کہاں ؟ "

" وہ یوجی ھو گئیں ھیں جیسے میرے پتا جی یوجی ھو گئے ھیں ۔ پھر ایک دن میں بھی بڑا ھو کے یوجی ھو جاؤں گا اور ظلم کے خلاف لڑوں گا ۔ رو نہیں چاچی !" نیلما نے اپنے بہتے ھوئے آنسو پونچھے بغیر منے کے ھاتھ میں لوتیکا کا خریدا ھؤا باجہ تھما دیا ۔

باجے کو دیکھ کے منے کو ایسا معلوم ھؤا جیسے وہ اپنی ماں کے مسکراتے ھوئے چہرے کو دیکھ رھا ھو ۔ اور جب اس نے باجے کو ھونٹوں سے لگایا تو نیلما کو ایسا معلوم ھؤا کہ لوتیکا اپنے ماستا بھرے ھونٹوں سے اپنے پیارے بچے کو چوم رھی ھے ۔

باھر طوفان گرج رھا ھے ۔

اندر منا باجہ بجا رھا ھے ۔

موم کی چٹان

شوکت اور اللہ داد نے گومتی کو کمرے سے دوڑتے ہوئے دیکھا اسے برآمدے میں سے ایک مست ادا سے بھاگتے دیکھا ۔ شوکت اور اللہ داد برآمدے کے باہر کے خوبانی کے درخت تلے دو اور سپاہیوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ شوکت سے نہیں رہا گیا ۔ بولا : " اللہ داد بڑی زنانے کی عورت ہے ۔ خدا کی قسم ایک دفعہ جس کو نظر بھر کے دیکھ لے وہ ہل نہیں سکتا ، وہیں سل پتھر ہو جاتا ہے ۔"

اللہ داد آہ بھر کے بولا : " اپنا اپنا نصیب ہے ۔"

شوکت نے کہا : " آہیں کیوں بھرتے ہو ۔ بڑی مرد مار عورت معلوم ہوتی ہے کیا عجب کبھی تم پر..."

اللہ داد نے جلد ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ بولا : " غضب ہو جائے گا شوکت ۔ تھانیدار نے سن لیا تو چکدم بنا دے گا ۔ تم نہیں جانتے ہو اس خبیث کو ، وہ بری طرح اس عورت کے جال میں گرفتار ہے ۔"

شوکت نے پتہ پھینکتے ہوئے کہا : " اپن تو پروا نہیں کرتے مگر نہ جانے کیوں اپنے کو یہ عورت اچھی نہیں لگتی ۔ جو مزہ خون پینے میں ہے کسی اور مزے میں نہیں یار ! میں تمہیں رامپور کا قصہ سناؤں ۔ ایک دفعہ کیا ہؤا کہ ایک عورت

مجھ پر بری عاشق ہو گئی ۔

اللہ داد نے سارے پتے پھینک دیے اور اُٹھ کے بولا : " ہٹاؤ یار کوئی بات کرو جی نہیں لگتا ۔"

" کیوں ، کیا ابھی تک ستا رہی ہے ؟"

اللہ داد خوبانی کے درخت کے نیچے اِدھر اُدھر ٹہل کر کہنے لگا : " اس کی بات چھوڑو ، یہ چڑیا اپنے پنجرے کی نہیں ہے ۔"

" پھر کس پنجرے کی بات کرتے ہو ؟ چار تو تمھارے گھر میں ہی ہیں ۔"

" چار سے کیا ہوتا ہے ۔" اللہ داد آہ بھر کے بولا ، "چار تو شروع سے ہی جائز ہیں ۔ میں اب پانچویں کے چکر میں ہوں ۔"

شوکت نے اللہ داد کو سر سے پاؤں تک دیکھا : " ہاں تمھارے ڈیل ڈول والے آدمی کو تو سرکاری سانڈ کی طرح پالنا چاہیے ۔"

اللہ داد ہنسنے لگا اور اپنے بازوؤں کی اُبھری مچھلیاں فخر سے دیکھنے لگا ۔

شوکت نے ایک عجیب مایوسی کے عالم میں اس سے کہا : " عورتیں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں گی ۔"

اللہ داد کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو گیا ۔ اس کا منہ پھول گیا اور گردن کی رگیں تن گئیں ۔

شوکت نے کہا : " اپن کو عورت بالکل پسند نہیں ۔ جانے اس میں کیا ہے ۔ اتنا ضرور پتا ہے جب چاقو انسانی جسم میں چلاتا ہوں تو بالکل کھیرا کاٹنے کا سا مزہ آتا ہے ۔"

اللہ داد نے کہا : " میری پانچویں بھی ہرے ہرے کھیرے کی طرح لچکیلی ، نرم اور ملائم ہے ۔ اس کا نام نوران ہے ،

نوراں ! سچ سچ نور ہی ہے - دیکھنے میں روشن اور چمکتی ہوئی ، سولہ سترہ برس کی - میں نے اس کے باپ کو پانسو روپے دیے ہیں -"

" نکاح کے لیے !"

" نہیں نکاح کے لیے ساڑھے سات سو اور دوں گا - پانسو میرے پاس جمع ہو گئے ہیں - دو چار دن یہی حلہ اور رہا تو دو سو اور بھی اکٹھے کر لوں گا -"

" پھر ؟ " شوکت نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا -

" پھر اپنے گاؤں میں شادی کے ڈھول بجاؤں گا : ڈر ڈر ڈگڑ ، ڈر ڈر ڈگڑ - اللہ داد اپنے پیٹ پر ڈھول بجا کر ناچنے لگا - شوکت اور دوسرے سپاہی ہنسنے لگے -

شوکت نے سوچ سوچ کے کہا : " سنو تو تم پانچ کو کیسے رکھ سکو گے - کسی ایک کو طلاق دو گے نا ؟"

" ہاں ! یہی کرنا پڑے گا -"

شوکت نے کہا : " مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک بیوی ڈھورڈ نگر چرانے گھاٹی پر جائے اور واں اس کا پاؤں نیچے پھسل جائے اور وہ کھڈ میں گر کر مر جائے -"

" ہو سکتا ہے -" اللہ داد آہستہ سے بولا -

" اور یہ بھی تو سکتا ہے کہ وہ آنگن میں رات کو سو جائے اور رات ہی کو جنگل کے بھیڑیے اسے اٹھا کے لے جائیں اور دوسرے یا چوتھے روز اس کی لاش..."

اللہ داد اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے آہستہ سے بولا : "ہاں ہو تو سکتا ہے -"

شوکت نے اپنا چاقو نکال کے اور اس کا پھل آنکھوں کے سامنے رکھ کے کہا : " مجھ سے کوئی مدد مانگتے ہو تو میں حاضر ہوں ۔"

اللہ داد نے ہنس کر شوکت کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا : " تمہارے ایسے دوستوں ہی کا تو سہارا ہے ۔ حالانکہ کوئی ایسی گڑ بڑ کی ضرورت نہیں ۔ طلاق بھی فوراً مل سکتی ہے اور اگر دیر بھی ہو تو نوراں کے باپ کو یہ دھوکا بھی دیا جا سکتا ہے کہ میں ابھی تک کنوارا ہوں اور میرا نام اللہ داد نہیں رحمت خاں ہے ۔"

شوکت نے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور مایوسی سے سر ہلا کر بولا : " جاؤ تم سے کیا بات کریں ، تم ہماری لائن کے آدمی نہیں ہو ۔"

اللہ داد زور سے ہنسنے لگا ۔ پھر یکایک چپ ہوگیا کیونکہ گومتی اب ایک چھوٹی سی مٹکی اٹھائے ان کی طرف چلی آ رہی تھی ۔ اللہ داد نے زیر لب کہا : " اسے اِدھر نہیں آنا چاہیے ۔ جانتی ہے ہم سپاہی لوگ ہیں ، پھر بھی اِدھر آ رہی ہے ۔ اسے دیکھ کر دل میں کچھ ہونے لگتا ہے ۔ مجھ سے کسی روز کچھ ہو جائے گا تو تھانیدار اور لالہ اپنی جان کو روئیں گے : یا خدا یہ اِدھر نہ آئے ، یا خدا یہ اِدھر نہ آئے ۔"

مگر گومتی دھیمی چال سے چلتی ہوئی اِدھر ہی آ رہی تھی : " مویشی خانے کی چابی مجھے دے دو ۔"

اللہ داد چپ رہا ۔

شوکت نے کہا : " کیوں ؟ "

" دودھ دوھنے جا رہی ہوں ۔"

شوکت بولا : " اندر بڑا خطرناک ملزم بند ہے ۔ اس کی ہتکڑیاں بھی کھلی ہیں ۔"

گومتی نے مسکرا کے اللہ داد کی طرف دیکھا ، بولی : " وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا ۔ پھر تم دونوں یہاں سامنے کھڑے ہو اور وہ باندی کا دروازہ ہے ۔ اگر وہ یہاں سے بھاگا تو دروازہ سامنے ہے ۔ تمہارے سامنے سے بھاگ کے کہاں جائے گا ؟ "

اللہ داد نے کہا : " ہمیں اپنی فکر نہیں تمہاری فکر ہے ۔"

گومتی نے معنی خیز نگاہوں سے اللہ داد کی طرف دیکھ کے کہا : " میں اپنی فکر خود کر لوں گی ۔"

اللہ داد نے شوکت کے ہاتھ سے چابی لے کے گومتی کو دے دی ۔ ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ گومتی کی انگلیوں سے مس ہؤا اور ایسا محسوس ہؤا جیسے ان میں سے کوئی شعلہ تڑپ کر بھڑک اٹھا ۔ گومتی گھوم کر چلی گئی ۔ اللہ داد اسے دیکھتا رہ گیا ۔

شوکت نے سر ہلا کے کہا : " اپن کو بالکل پسند نہیں ۔ اگر مجھے دنیا کی کوئی سب سے خوبصورت عورت لا کے دے اور ایک طرف وہ عورت اور دوسری طرف یہ چاقو رکھ دے تو میں اپنا چاقو اٹھا لوں ... "

اللہ داد نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ وہ گومتی کو دیکھ رہا تھا ۔ گومتی باندی کے دروازے پر پہنچ گئی ۔ پھر اس نے چابی لگا کے تالا کھولا ۔ پھر دروازہ کھلا پھر دروازہ بند ہو گیا ۔

باندی کے بدبو دار دھیال پر پڑے پڑے عبدل نے پوچھا :

"کون ہے ؟"

ایک لمحے کے لیے اس نے دیکھا کہ دروازے کی پتلی دراز میں ایک حسین عورت کھڑی ہے - حسین عورت ، حسین لڑکی نہیں - پھل دار درخت کی طرح شگفتہ اور شاداب عورت دروازے میں کھڑی ہے - ایک لمحے کے لیے اس کے نتھنوں میں ایک بے نام سی مہک لہرائی - پھر دروازہ بند ہو گیا اور نیم تاریکی اور نیم روشنی اور مویشی خانے کی نیم گرم فضا میں اس نے اس عورت کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا -

گومتی خاموش قدموں سے چلتے ہوئے بالکل اس کے سر پر آن پہنچی - ایک لمحے کے لیے وہاں رکی ، عبدل اٹھ کے بیٹھ گیا لیکن گومتی نے اسے کچھ نہیں کہا - وہ وہاں سے گھوم کر اپنی دودھیلی گائے کے پاس چلی گئی اور بچھڑے سے گائے کے تھنوں میں دودھ اتروا کر بچھڑا قریب میں باندھ کے دودھ دوھنے لگی -

عبدل نے کہا : " شاھنی ! پہلے میں نے تمھیں پہچانا نہیں - ان پانچ سالوں میں تم میں بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے -"

گومتی نے کہا : " پہلے میں نے بھی تمھیں نہیں پہچانا - پانچ سال پہلے تم بالکل لڑکے سے تھے -

عبدل نے کہا : " شاھنی ، انھوں نے میرے باپ کو بے قصور مار دیا ہے -"

گومتی چپ چاپ دودھ دوھتی رھی اور دودھ کی سفید سفید برف کی طرح چمکتی ہوئی دھاریں مٹکی میں گونج پیدا کرتی ہوئی گرتی رھیں - عبدل کو ایسا معلوم ہؤا جیسے یہ دھاریں اس کے گلے میں گر رھی ہوں - وہ اپنے حلق پر ھاتھ رکھ کے بولا :

"شاهنی میں نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ۔"

گومتی چپ چاپ دودھ دوهتی رهی ۔

بچھڑے نے دودھ کو دیکھ کے زور سے اپنی ماں کو آواز دی ۔

گائے زور سے ڈکرائی ۔

دودھ مٹکی میں گرتا گیا ۔

عبدل بھوک اور پیاس سے سخت بے تاب تھا ۔ وہ دودھ کی دھاروں کی " دھاں ! دھاں !" نہیں سن سکتا تھا ۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور دھیال میں اپنا منہ چھپا لیا ۔

گومتی نے دیکھا کہ مٹکا جھاگ سے چھلک رہا ہے ۔ وہ آهسته سے گائے کے پاس سے اٹھی ، بچھڑے کو پھر سے کھول کے گائے کے پاس جانے دیا ۔ بچھڑا بھاگتا ہوا ماں کے تھنوں کے پاس گیا اور منہ مار کے چسر چسر دودھ پینے لگا ۔

مٹکا جھاگ سے چھلک رہا ہے ۔

عبدل دھال میں منہ چھپائے لیٹا ہے ۔

گومتی اس کے سر پر کھڑی ہے ۔

گومتی نے کہا : " اٹھو دودھ پی لو ۔"

عبدل لیٹا ہوا تھا ، اٹھ کر بیٹھ گیا اور اب کھڑا ہونے والا تھا کہ گومتی جھک کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے کندھے سے لگ کر اس نے مٹکی کو اس کے منہ سے لگا دیا ۔

عبدل غٹاغٹ دودھ پیتا گیا ۔ مٹکی پہلے چھلک رہی تھی ۔ پھر وہ جھاگ جیسے اندر جاتا ہوا معلوم ہوا ۔ پھر مٹکی پونی ہو گئی پھر مٹکی آدھی ، پھر خالی ہو گئی ۔ اب صرف عبدل کے

ھونٹوں کے گرد دودھ کا جھاگ لگا ھؤا تھا ۔

گومتی نے اپنے مہین ململ کے پلو سے اس کے ھونٹوں کے کے گرد جھاگ کو پونچھ دیا ۔ اس کی ٹھوڑی اور نتھنوں کے گرد جمے ھوئے خون کو صاف کیا ۔ عبدل نے ایک دو بار اس کا ھاتھ روکا مگر وہ ھاتھ رک نہیں سکا ۔ عبدل کے اپنے ھاتھ بالکل کمزور پڑ گئے اور اس کے چاروں طرف ایک عجیب سی خوشبو ، ایک عجیب سی سنسنی ، ایک عجیب سی ملائمت پھیل گئی ۔

گومتی نے کہا : "میں نے سنا ھے تم شہر میں سکول ماسٹر ھو اور آٹھویں پاس ھو ۔"

" ھاں ۔" عبدل بولا ، " اور اب میں دسویں کا امتحان دینے راولپنڈی جا رھا تھا کہ..."

" راولپنڈی !" گومتی بڑی مدھم آواز میں بولی ، " میں ایک بار شادی سے پہلے راولپنڈی گئی تھی ۔ اپنے قصبے بھون سے راولپنڈی گئی تھی ۔ وھاں راولپنڈی میں میرا ایک رشتے دار رھتا ھے ، سجن دیو ۔ پہلے میری اس سے شادی ھونے والی تھی پھر پتا چلا کہ وہ ھمارا رشتے دار ھے اور ھماری شادی نہ ھو سکی ۔ کیوں جس سے ھم پیار کرتے ھیں اس سے ھم شادی نہیں کر سکتے ۔" گومتی نے عبدل سے پوچھا ۔

عبدل نے کوئی جواب نہیں دیا ۔

گومتی نے کہا : " تم راولپنڈی جاؤ گے تو سجن دیو سے ضرور ملنا ، ضرور ۔ اب اس نے بھی شادی کر لی ھو گی ۔ اس کے بال بچے ھوں گے ۔ ضرور جانا اس کے پاس ۔ دیکھنا اس کی

بیوی کیسی ہے ، خوبصورت ہے کہ...مگر ضرور خوبصورت ہو گی...دیکھو وعدہ کرو کہ جب تم راولپنڈی جاؤ گے تو...

عبدل نے کہا : " فی الحال تو میں جیل جاؤں گا ۔"

" جیل کیوں جاؤ گے ؟ نہیں نہیں ، تم ضرور راولپنڈی جاؤ گے ۔ میں تمھیں راولپنڈی بھیج کے رہوں گی ۔"

عبدل نے کہا : " وہ کیسے ؟ "

گومتی نے کہا : " تم دیکھتے جاؤ ۔"

اتنا کہہ کے گومتی نے عبدل کے گلے پر اپنے پتلے پتلے ناخن پھیر کے جمے ہوئے خون کی دھاروں کو صاف کیا ۔ عبدل کے گلے کی رگیں کیسی صاف ، سیدھی تنی ہوئی تھیں ۔ نیچے حلق کے نیچے کی دو مضبوط ہڈیاں...گومتی آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی گئی ۔ عبدل گھبرا گیا ۔ بولا : " وہ — میں تم کیسے ... میری مدد کرو گی ۔"

گومتی مسکرائی اور اس کے سینے کا اُبھار عبدل کو اپنے سینے سے اُٹھتا ہؤا معلوم ہؤا ۔ جیسے پھلوں سے لدی پھندی شاخیں یکایک طوفان کے جھونکے سے اوپر اُٹھ جائیں ۔ عبدل بالکل چوکنا ہو کر اور کچھ مایوس ہو کر گومتی کو کھڑا ہوتے ہوئے دیکھنے لگا ۔ گومتی نے مٹکی اُٹھا لی ۔ پھر اس نے ایک عجیب انداز سے اس کی طرف دیکھ کر ہؤا کے جھونکے کی طرح لطیف آواز میں کہا : " اچھا میں رات کو آؤں گی ۔"

اتنا کہہ کے گومتی منہ پھیر کے چل دی اور عبدل کوئی احتجاج نہ کر سکا ، کوئی انکار نہ کر سکا ۔ کیوں آئے گی ؟ وہ اس کی کون ہے ؟ وہ اس کا کون ہے ؟ وہ کیسے آ سکتی ہے ؟

کس لیے اس نے اسے مسخ نہیں کیا ؟ یہ کیسا جذبہ ہے ، کس طرح کا احساس ہے جس نے اس کی زبان بند کر دی ہے ۔ عبدل ان سوالوں کا کوئی جواب نہ دے سکا ۔ سوال دودھ کے بلبلوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے اس کے ذہن میں گم ہوتے گئے ۔

باانڈی !

باانڈی سے باہر نکل کے گومتی نے چابی اللہ داد کو دے دی ۔

شوکت نے پوچھا : " مٹکی خالی ہے شاہنی !"

گومتی نے کہا : " تمھارے ملزم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ۔"

اللہ داد نے کہا : " تھانیدار کا حکم تھا اسے کچھ نہ دیا جائے ۔"

گومتی نے کہا : " اچھا تو پھر اللہ داد تھانیدار سے کچھ نہ کہنا ، میں رات کو بھی اسے کھانا کھلاؤں گی ۔"

گومتی معنی خیز نظروں سے اللہ داد کو دیکھ کر مسکرائی ۔ ایسی صاف اور روشن مسکراہٹ تھی وہ ، اللہ داد بھونچکا سا رہ گیا ۔ کانپتے ہوئے لہجے میں بولا :

" بہت اچھا شاہنی !"

جب گومتی چلی گئی تو شوکت نے کہا : " تم اچھا نہیں کر رہے ہو دوست !"

اللہ داد خوبانی کے آس پاس گھوم کر ٹہلنے لگا ۔ پھر اس نے رک کر شوکت سے اونچی آواز میں کہا : " بھاڑ میں جائے تھانیدار ۔"

اللہ داد خود اپنی اونچی آواز پر حیران رہ گیا ۔

گومتی برآمدے میں سے گزرتی ہوئی اپنی جسارت پر مسکرائی - پھر اس نے چھتے ہوئے برآمدے میں کھڑے ہو کر دیکھا کہ گل ایک تنگ قمیض اور بڑے گھیرے والی نئی شلوار پہنے جنوبی راستے سے اس کے مکان کی طرف آ رہی ہے - گل بڑی ہی خوبصورت لڑکی ہے ، گومتی نے سوچا - کئی سالوں سے میراں شاہ اس کے ساتھ منہ کالا کرنا چاہتا ہے مگر آج تک اس کی ہمت نہیں ہو سکی - یہ تو نہیں ہو سکتا کہ گل کو اس کا پتا نہ ہو ، آخر عورت ہے وہ ضرور جانتی ہوگی - جب لالہ میراں شاہ حیران نظروں سے اسے دیکھتا ہے تو وہ کیا دیکھتا ہے - جب وہ گل کی جھولی گری ، چھوارے اور مکھانوں سے بھر دیتا ہے تو اس کے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہوتے ہیں - جب اس نے جی کڑا کر کے گل کو ریشمی سوسی کی قمیض اور شلوار کا کپڑا بھی مفت دے دیا تھا - اس وقت اس کے دل کی کیا حالت تھی ، مگر گومتی کو خوب معلوم تھا کہ اس کا خاوند صرف قدموں میں لوٹ سکتا ہے ، محبت نہیں کر سکتا - اس میں یہ ہمت بھی نہیں کہ گل سے کہہ سکے: میں تیرا دل چاہتا ہوں— بزدل !

گومتی نے گل کو جنوبی پگڈنڈی سے اوپر چڑھتے اور پھر اسے لالہ میراں شاہ کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا - وہ مسکرائی - اتنے میں اسے اپنے قریب قدموں کی آواز سنائی دی - اس نے پلٹ کے دیکھا : ٹھاکر کاہن سنگھ اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے اور مسکرا رہے تھے -

گومتی نے پوچھا : ” راجہ جی کیسے ہیں ؟ “

" شہر سے ڈاکٹر آیا ہے کہتا ہے مہینے بھر میں اچھے ہوں گے۔"

گومتی چپ رہی۔

ٹھاکر کاہن سنگھ نے کہا : " ہم نے سوچا چلو شاہنی کو دیکھ آئیں اور اپنے یار تھانیدار سے بھی دو دو باتیں کر لیں۔"

گومتی مسکرائی۔ بولی : " آج یہیں رہیے نا ، شہر سے نئی شراب منگائی ہے اور — ٹھاکر کاہن سنگھ نے بالکل قریب آ کے پوچھا۔

گومتی ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ بولی : " اور ایک نئی بوتل بھی ہے۔"

" کہاں ؟ "

" وہ سامنے لالہ کے کمرے میں ، ابھی آپ کو دکھاتی ہوں۔"

لالہ ، گل کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا۔ گل اتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی ، اتنی پیاری جیسے اس کے کمرے میں بہار کا جھونکا آ گیا ہو۔ لالہ اس وقت ترازو میں کچھ سامان تول رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ترازو ڈگمگا کے چھوٹ گیا اور لالہ بالکل گڑبڑا کے کہنے لگا : " ارے گل تم ہو !"

گل کے مہندی بھرے ہاتھ جھکے اور اس کی ایک انگلی اس کی ستواں ناک کی گول اور سنہری کیل پر رک گئی۔ وہ شرما کے اور لجا کے بولی :

" بھی ، شاہ جی۔"

گل زمین پر بیٹھنے والی تھی کہ لالہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا : " ارے کیا کرتی ہو ، یہاں۔ یہاں۔ یہاں تخت پوش

پر بیٹھو - وہ گل کو ہاتھ سے پکڑ کے تخت پوش پر لے آیا - اس نے بھی کھاتے سمیٹ کے الگ رکھ دیے اور ہاتھ ملتے ہوئے بولا :

" بولو کیا چاہیے تمھیں ؟ "

" چھوارے دوں ؟ مکھانے ، مصری نئی آئی ہے - شیشہ ، کنگھی - نئی پھول دار چھینٹ - گل کیا چاہیے تمھیں ؟ "

گل ہنسی - جیسے اسے اپنی طاقت کا احساس ہو - بولی :

" لالہ مجھے کانچ کی ستریاں اور گلے کی وہ ہرے رنگ کی مالا دے دو تو بڑی مہربانی ہو گی تمھاری - "

" ارے مہربانی کیسی ؟ مہربانی کیسی - گل یہ لو ، یہ لو... تمھارے لیے تو - مگر اچھا - لالہ ایک عجیب حسرت سے گل کو دیکھ کے کہنے لگا : " سنا ہے بھادوں میں تمھاری شادی ہونے والی ہے ! "

گل نے لجا کے گردن جھکا لی - اس کا چہرہ گردن سے لے کے جبین تک سرخ ہو گیا -

لالہ ہاتھ ملنے لگا : " ہائے ! گل چلی جائے گی - یہ سونے کی مورت ، یہ ناز و ادا کا پیکر ، یہ موہنی مورت بھی اس گاؤں سے چلی جائے گی - " میراں شاہ چپ ہو گیا - ایک بار اسے اپنے گدھے سے پیار ہؤا تھا - ایک بار اس نے گوستی کو چاہا تھا لیکن دولت کے سوا کسی نے اسے نہ چاہا اور دولت کو چاہنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی گدھے سے محبت کرے - اتنی دولت پا کر بھی میراں شاہ کے دل میں راکھ اڑ رہی تھی اور زبان پر مٹی کا ذائقہ تھا اور وہ گل کو دیکھ کر حسرت سے ہاتھ مل رہا تھا -

گل نے اپنی چیزیں سمیٹ کے کہا : " اچھا تو میں جاؤں - "

پچھلے چار سال سے یہی ہو رہا تھا ۔ گل آتی ، چند چیزیں پسند کر لیتی لیکن چیزیں دینے والے کو کبھی اپنی پسند کا موقع نہ دیتی ۔ پھر ایک رذیل بزدل ، مگر وہ لمحہ آتا جب وہ دونوں چپ ہو جاتے ۔ گل اس لیے کہ وہ احسان نہ چکا سکتی تھی ۔ لالہ اس لیے کہ وہ یہاں پر اسے احسان نہیں سمجھتا تھا ۔ اس لیے یہ لمحہ بڑا خاموش اور طویل ہو جاتا ۔ ایک عظیم غبارے کی طرح پھولتا جاتا حتیٰ کہ جب لالے کو معلوم ہوتا کہ یہ غبارہ اب پھٹ پڑے گا تو وہ ایک عجیب سی آواز میں کہتا : "اچھا تو تم جاؤ، گل ۔" اور گل چلی جاتی لیکن آج نہ جانے کیوں لالہ یہ بھی نہ کہہ سکا ۔ صرف حسرت بھری نگاہوں سے اسے چپ چاپ دیکھتا رہا اور گل نے آہستہ آہستہ اپنے قدم باہر بڑھائے ۔

یکایک لالے نے کہا : " اے گل... ہماری گائے نے بچھڑا دیا ہے ، بڑا ہی خوبصورت ۔ اس کے ماتھے پر سفید تارہ بھی ہے ، تو دیکھے گی ؟ "

" کہاں ہے ؟ ؟

" باڑی میں !"

گل نے سوچا احسان چکانے کا لمحہ آ گیا ۔ احسان آخر احسان ہی ہوتا ہے ، محنت نہیں ہوتا ۔ ان پچھلے چار سالوں میں لالہ اسے برا اور مکروہ ضرور معلوم ہوتا تھا مگر کبھی اتنا برا اور مکروہ نہیں معلوم ہؤا تھا جتنا اس وقت ۔ اس سے پہلے لالے کی خاموشی میں ایک عجیب رقت آمیز خوشامد کرتی ہوئی محبت کا شائبہ سا محسوس ہوتا تھا ۔ آج اس میں صرف بدبو تھی ، خالی گندی بدبو ۔

گل نے شکایت آمیز لہجے میں کہا : " لالہ بھادوں میں میری شادی ہونے والی ہے ۔"

لالہ اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے باڑی کی طرف کھینچ کے لے جانے لگا : " ارے بڑا اچھا بچھڑا ہے ، بڑا ہی خوبصورت ۔ یہ قریب ہی تو مویشی خانہ ہے ۔"

گل انکار کرتی گئی ، جوں جوں باڑی قریب آتی گئی ، لالے کا اصرار بڑھتا گیا اور گل کی مزاحمت بڑھتی گئی ۔ اب لالہ بالکل اپنے آپے سے باہر ہو گیا تھا ۔ اس کا دم پھول رہا تھا اور چہرہ غصے سے سیاہ ہو گیا تھا ۔ اسے اپنے آپ پر ، اپنی ترچھی ناک پر ، اپنی بدصورتی پر ، اپنی کمینگی پر ، گل کے حسن پر ، گومتی کی بے وفائی پر غصہ آ رہا تھا ۔ وہ کیوں غصہ نہ کرے ۔ کیا اس کا غصہ بجا نہ تھا ؟ گل کو یہ احسان چکانا ہوگا ۔ آخر یہ احسان ہو کر رہا ۔ یہ جذبہ بھی محبت نہ بنا ، کیوں وہ اسے باڑی کی طرف گھسیٹ رہا تھا ۔ یکایک اس کے کانوں میں ہنسی کی آواز آئی ۔ اس نے گھوم کر دیکھا ، شوکت اور اللہ داد اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہے تھے ۔

لالہ رک گیا ۔

اللہ داد نے کہا : " کیا بات ہے لالہ ، کدھر جا رہے ہو ؟ باڑی میں تو ہمارا قیدی بند ہے ۔"

یکایک لالے کو یاد آیا اور اس کی گرفت گل کے ہاتھ پر ڈھیلی ہو گئی ۔ گل ہاتھ چھڑا کے جلدی سے بھاگی اور شوکت اور اللہ داد کے قریب سے ہوتی ہوئی خوبانی کے درخت سے گزرتی ہوئی باڑھ کو پھلانگ کے نیچے رستے پر جانے والی تھی کہ کوئی

بالکل اس کے سامنے آ گیا اور اس نے اسے مضبوط ھاتھوں سے پکڑ لیا ۔ گل نے گھبرا کر دیکھا : سامنے ایک لمبا تڑنگا جوان آدمی لمبی مونچھیں رکھے کھڑا ھے اور اس کے پاس گومتی کھڑی ھے اور وہ اس جوان کی مضبوط باھوں میں ھے ۔

" ھٹو مجھے چھوڑ دو ۔"

" ارے یہ تو سچ مچ نئی بوتل ھے ۔" کاھن سنگھ نے خوش ھو کے کہا ۔

گومتی نے کہا : " بھادوں میں اس کا بیاہ ھونے جا رھا ھے ۔

" مجھے جانے دو ۔" گل چلائی ۔

" بھادوں تو بہت دور ھے اور رات آج جوان ھے اور میرے ھاتھ بہت مضبوط ھیں ۔"

رات آج جوان ھے اور گل ٹھاکر کاھن سنگھ کے کمرے میں ھے ۔ رات آج جوان ھے اور گومتی تھانیدار حشمت اللہ بیگ کے کمرے میں ھے ۔ رات آج جوان ھے اور سپاھی خوبانی کے پیڑ کے نیچے تاش کھیل رہے ھیں ۔ رات آج جوان ھے اور دولت بوڑھی ھو چکی ھے اور لالہ میراں شاہ اپنے دل کی ساری جھریاں گنتا ھؤا کبھی اس کمرے سے اس کمرے ، کبھی اس برآمدے سے اس برآمدے میں جاتا ھے اور سوچتا ھے کیا وہ کسی طرح اس جوان رات کے سینے میں گھونسا نہیں مار سکتا ۔ ایک ایسا زبردست گھونسا جس سے سارے کمروں کے کواڑ چرچرا جائیں اور سارے برآمدوں کی چھتیں ھوا میں آڑ جائیں اور شرابی قہقہوں کی دھجیاں فضا میں بکھر جائیں ۔ کیا ایسا نہیں ھو سکتا ھے ؟ کیا ایسا نہیں ھو سکتا ھے ؟ یہ جوان رات... لالہ میراں شاہ نے غصے میں اپنے

دانت پیس لیے -

رات آج جوان ھے اور بڑی عجیب ھے - گومتی نے سوچا یہ میرے دل میں کیسی ترنگیں سی اٹھ رھی ھیں جیسے آج پہلی بار میرا بیاہ ھو رھا ھے - آج اس نے اپنا سب سے اچھا عنابی رنگ کا شنیل کا سوٹ پہنا اور ھاتھوں میں کامدار چوڑیاں پہنیں اور پیلے گلاب کا عطر لگایا - آج وہ خود بالکل نئی نئی سی محسوس کر رھی تھی - لالے کی پریشانی سے اسے بڑی مسرت ھوئی تھی اور گل کی چیخیں سن کے اسے وہ دن یاد آ گیا تھا جب تحصیلدار صاحب پہلی بار اس کے گھر آئے تھے اور لالہ میراں شاہ ان دونوں کو ایک کمرے میں اکیلا چھوڑ کے رات کے دس بجے کسی ضروری کام کا بہانہ کرکے نیچے گاؤں میں چلا گیا تھا اور دو بجے واپس آیا تھا - آج گل کو بھی گھر جاتے ھوئے دو بجیں گے - ھائے یہ رات کتنی حسین ھے ! آج وہ کس طرح حشمت اللہ بیگ کو تڑپائے گی ، اس کی موٹی حرص کی ھڈیوں پر سے گوشت نوچ نوچ لے گی لیکن اسے قریب نہیں پھٹکنے دے گی -

گومتی سج سجا کے ھاتھ میں کھانے کا تھال لے کے باندی کی طرف چلی - اللہ داد اور شوکت پہرے پر تھے -

گومتی نے اللہ داد سے کہا " چابی ؟ "

اللہ داد نے چابی دے دی -

گومتی نے کہا : " لالہ پوچھے تو کہہ دینا میں تھانیدار صاحب کو کھانا کھلا رھی ھوں اور تھانیدار پوچھے تو کہہ دینا میں لالے کے پاس ھوں -"

" لیکن -" اللہ داد نے کہا -

" لیکن ویکن کچھ نہیں ۔ دونوں ایک دوسرے کو پوچھنے کی کبھی ھمت نہیں کریں گے ۔ اس لیے کوئی ڈر نہیں مجھے۔ میں اس تمھارے ملزم کو کھانا کھلا کے آتی ھوں ۔"

گومتی نے تالے کو چابی لگائی ۔

دروازہ کھلا ۔

اللہ داد کانپنے لگا ۔

بانڈی کے اندر عبدل کو پھر وھی بے نام سی مہک آئی ۔ ارے یہ تو پہلے گلاب کی مہک ھے ، ھاتھ میں تھال لیے اور تھال کے اندر چراغ جلائے ھوئے یہ سونے کی مورت اس کی طرف بڑھتی آ رھی ھے ۔ عبدل آٹھ کر بیٹھ گیا ، بیٹھ کر کھڑا ھوگیا ۔ کھڑا ھو کر اس مورت کی طرف چلنے لگا ۔ اس نے تھال ھاتھ سے تھام کر نیچے آتروا لیا اور اس نیم اندھیرے اور نیم آجالے میں اسے گومتی کے پراسرار ھونٹ اور اس کی سحر آمیز آنکھوں کی وحشی چمک اِک عجیب سا پیغام دیتی ھوئی معلوم ھوئی ۔ عبدل کا دل کانپنے لگا اور نوراں بہت دور تھی اور گومتی کے جسم کی پکار بہت نزدیک تھی ۔ اور خود اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رھا تھا ۔ اسے اپنی اس جوانی سے بھی خوف آنے لگا جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی زندہ تھی اور اسے موت سے کھیلنے پر مجبور کر رھی تھی ۔

گومتی نے کہا : " کھانا کھا لو ۔"

عبدل نے کہا : " آؤ پہلے باتیں کر لیں ۔"

وہ دونوں سرسراتے ھوئے خشک دھیال پر بیٹھ گئے ۔ ایک دوسرے کے بالکل قریب ۔

عبدل نے پوچھا : " مجھے راولپنڈی بھیجنے کی تم نے کیا ترکیب سوچی ہے ؟ "

گومتی سب کچھ بھول چکی تھی : راولپنڈی ، ترکیب ، عبدل ، گرفتاری ۔ اسے صرف عبدل یاد تھا : دن کو ، سہ پہر کو ، شام کو ۔ اب تک صرف عبدل یاد رہا تھا ۔ اب یکایک جیسے عبدل نے اس کی یاد کو کھرچا تو راولپنڈی نکل آیا ۔ تازہ ، گرم ، لہو کی طرح زندہ اور اس کے اندر سے سجن دیو... سجن دیو ہنستا ہؤا اس کے سامنے کھڑا تھا اور گوماں کے دونوں ہاتھ اس کے دونوں ہاتھوں میں تھے اور ایک ایسی پاکیزہ مسکراہٹ جو گومتی نے اس کے بعد نہ کبھی اپنے چہرے پر ، نہ کسی دوسرے چاہنے والے کے چہرے پر دیکھی تھی ۔ گومتی یکایک ساری باتیں ، سارے ڈھنگ ، سارے عشوے بھول گئی ۔ آج سے کئی برس پہلے کی الھڑ لڑکی بن گئی جو سچے دل سے محبت کرنا چاہتی تھی لیکن جسے میراں شاہ کی دولت اپنی طلائی زنجیروں میں باندھ کے کھینچ لائی ۔ گومتی کا سینہ زور زور سے ہلنے لگا ۔ عبدل کا چہرہ بھی تو ایسا تھا ، سجن دیو کی طرح ، سندر ، پاکیزہ ، بھولا اور الجھا ہؤا جیسے وہ کچھ نہ سمجھ رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے ۔ اسے جسم کی پکار کو سننا ہے یا اسے اوپر اٹھا کر ایک نئی سطح پر لے جانا ہے ۔ جوان ، ناتجربہ کار ، ناپختہ چہرہ ۔ چہرہ جو رہنمائی اور مدد اور ڈھارس چاہتا ہے ۔ اسے عبدل ایسا چہرہ کیوں نہیں ملا ، اسے میراں شاہ کیوں ملا ؟ کیوں ؟ کیوں ؟ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا ۔

عبدل نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا ۔

" مجھے مت چھوؤ ۔" گومتی نے اسے دھکا دے کر کہا ۔

عبدل حیران رہ گیا ۔

گومتی نے عبدل کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا ۔ بولی : "مجھے معاف کر دو ، میں اس وقت اپنے آپے میں نہیں ہوں ۔ میں چاہوں تو تم کو تباہ کر سکتی ہوں مگر نہیں کروں گی ۔ تمھیں زندہ رہنے کا حق ہے ۔"

" کیسی عجیب باتیں ہیں تمھاری شاہنی ؟ "

" ہاں عجیب تو ہیں ، عبدل جب تم بیاہ کرو گے تو میری باتیں یاد کرو گے ، کسی نے تمھیں یوں مٹھی میں بند کر کے چھوڑ دیا تھا ۔"

" عبدل نے کہا : " میں نوراں سے شادی کروں گا ۔"

" نوراں کون ہے ! " گومتی نے گھبرا کے کہا ۔

عبدل کے دل میں نوراں اب یوں آئی جیسے دور سے گھنٹی کی صدا آئے اور ہر لحظہ قریب آتی جائے ۔ نوراں ، نوراں ، نوراں ، نوراں ، نوراں ، نوراں... عبدل کا چہرہ مسرت سے کھلتا گیا ۔ اس نے بڑے ہی پیارے من موہنے لہجے میں کہا :

" نوراں میری ہونے والی بیوی ہے ۔"

گومتی عبدل کے قریب سے اٹھ بیٹھی ۔ بولی : " تم کھانا کھا لو تو پھر میں تمھیں آزاد کر دوں گی ۔"

عبدل نے کہا : " آزادی کا خیال آتے ہی میری بھوک اڑ گئی ہے ۔"

" تو چلو اسی وقت باہر چلو ۔"

عبدل اٹھ کھڑا ہؤا ۔

گومتی نے کھانے کے تھال کی طرف دیکھا : کتنی محنت اور محبت سے اس نے کھانا تیار کیا تھا ۔ کتنی محنت اور محبت سے وہ آج سجی تھی ۔ کتنی جوان راتوں کی آسید بھری ترنگیں لیے آج وہ اس ہانڈی میں آئی تھی ۔ یکایک غصے میں آ کے گومتی نے زور سے تھال کو ٹھوکر ماری اور تھال جھنجھناتا ہؤا ، چکراتا ہؤا ، فضا میں لڑھکتا ہؤا دیوار سے جا لگا اور وہاں سے گر کر بھینس کے پاس جا گرا ۔ بھینس تھال کو سونگھنے لگی جیسے لالہ میراں شاہ کھانا کھا رہا ہو ۔

عبدل نے کہا — ” کیا — کرتی ہو ۔“

” کچھ نہیں !“

عبدل بولا : ” باہر کے سپاہی مجھے کچھ نہیں کہیں گے ۔“

” نہیں کچھ نہیں کہیں گے ۔“

” میں کس طرح تمھارا شکریہ ادا کروں ۔“

” اس کی ضرورت نہیں ہے ۔“

” میں راولپنڈی میں ضرور سجن دیو سے ملوں گا ۔“

” تمھاری مرضی ۔“

” اس سے مل کے کیا کہوں ؟“

یکایک گومتی کو چکر آ گیا ۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی ۔ پھر بڑے ہی مایوس ، ناآسید ، اداس پھیکے لہجے میں کہنے لگی : ” اس سے کہنا جس لڑکی سے تو محبت کرتا تھا وہ آج کل چکلے میں بیٹھی ہے ۔“

” شاہنی کیا کہتی ہو ؟“

" سچ کہتی ہوں عبدل ۔" گومتی سسکنے لگی ۔

پھر یکایک اس نے اپنا جی کڑا کر لیا ۔ بولی : " اچھا اب یہ دروازہ کھول دو اور باہر چلے جاؤ ۔"

" باہر سپاہی جو ہیں ۔"

" تم دروازہ تو کھولو ۔"

عبدل نے دروازہ کھولا ۔ دروازہ زور سے چرچرایا ۔ باہر کی روشنی اندر آئی ، اندر کا اندھیرا باہر گیا ۔ عبدل دروازے پر کھڑا رہا ۔ شوکت اور اللہ داد اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

" کون ہے ؟ " شوکت نے للکارا ۔

" میں عبدل ہوں ۔"

شوکت نے چاقو نکالا ، اللہ داد آگے بڑھ آیا ۔

" کیا بات ہے شاہنی ؟"

گومتی نے ہر قسم کے جذبات سے عاری لہجے میں کہا : " یہ بانڈی کا دروازہ ہے ، اس دروازے سے ایک آدمی باہر جائے گا اور ایک آدمی اندر آئے گا ۔"

ایک بھینی بھینی خاموشی کے بعد اللہ داد نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا : " اچھا !"

" نہیں نہیں ۔" عبدل نے زیرِ لب کہا ۔

" شوکت بولا : " کیا کر رہے ہو اللہ داد ۔"

" نہیں نہیں مجھے منظور نہیں ہے ۔" عبدل بولا ۔

گومتی نے بڑی سختی سے کہا : " اب تم ایک لمحے کی دیر نہ کرو ۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے ، اور ممکن ہے میں اپنا ارادہ بھی بدل دوں ۔ اس ایک لمحے کی نیکی سے فائدہ اٹھا لو

اور بھاگ جاؤ اور میں یہاں باڑی کے اندر کھڑی ہوں اور تمہیں دیکھتی رہوں گی جب تک تم نظروں سے غائب نہ ہو جاؤ گے اس باڑی کے اندر کوئی قدم نہیں رکھ سکے گا ۔"

گومتی نے دھکا دے کر عبدل کو باڑی سے باہر نکال دیا ۔ عبدل دھیمے دھیمے قدموں سے چلتا رہا اور مڑ مڑ کر دیکھتا رہا ۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگا ۔ آخر میں وہ دوڑتا ہوا جنوبی ڈھلوان سے نیچے اتر گیا ۔ حد افق پر گومتی کو امید تھی وہ مڑ کر ضرور دیکھے گا مگر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا ۔ گومتی کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی ۔ اس نے آہستہ سے لرزتی ہوئی آواز میں اللہ داد سے کہا :

" اندر آ جاؤ اللہ داد ، مویشی خانے کا دروازہ تمہارے لیے کھلا ہے ۔"

نیا خزانہ

میں اپنے بستر پر بڑے آرام سے لیٹا ہؤا تھا اور نیم غنودگی کے عالم میں اپنی پرانی کہانی پڑھ رہا تھا جس میں لڑکی بہت خوبصورت تھی محبت بڑی اداس تھی اور انجام کچھ ایسا تھا اور کچھ ایسا نہیں بھی تھا ۔ بڑی ھی نرم نرم ، نیم گرم شہد سے بھری کہانی تھی جو شاید نیم بیداری کے عالم میں لکھی گئی تھی ۔

اتنے میں میرا لڑکا : عمر چھ سال ، قد چھوٹا ، نیکر پھٹی ہوئی ، آنکھیں چمکتی ہوئیں ، اچھل کر میرے بستر پر آ گیا اور بڑی بے قراری مگر چاؤ بھرے انداز میں مجھ سے پوچھنے لگا :

" میرا خزانہ دیکھو گے ؟ "

" خزانہ ۔"

" ھاں ۔" اس نے کہا ، " بالکل نیا خزانہ ھے ، دیکھو گے ؟"

میں نے کہا : " دکھاؤ ، دیکھیں گے ۔ لیکن تمھارا پہلا خزانہ کیا ہؤا ؟ "

لڑکے نے کہا : " وہ میں نے مالی کے لڑکے بجو کو دے دیا ۔"

اتنا کہہ کے لڑکے نے اپنی بند جھولی میرے سامنے کھول دی ۔ سب سے پہلے اس نے ایک ماچس کی ڈبیہ نکالی ۔ اس ڈبیہ کو اس نے یوں کھولا جیسے تماشا شروع ہونے سے پہلے اسٹیج سے پردہ ھٹایا جاتا ھے ۔ جب پردہ ھٹ گیا تو میں نے دیکھا کہ

ماچس کی ڈبیہ کے اندر کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اکٹھے کیے ہوئے تھے ۔

" یہ کیا ہے ؟ " میں نے پوچھا ۔

لڑکے نے میری طرف دیکھا گویا اسے میری بے وقوفی پر افسوس ہو رہا ہو ۔ مگر اس کی نگاہ میں تیکھا پن تھا ۔ میرا لڑکا مجھے شفقت سے سمجھاتے ہوئے بولا : " دیکھو یہ موتی ہیں ۔ "

" موتی ہیں ؟ "

" ہاں ، ممی کی چوڑیوں سے بنائے ہیں ۔ "

اس کے بعد اس نے خزانے کی ڈبیہ کو بند کر دیا اور ایک دوسری ڈبیہ نکالی ۔ اس ڈبیہ میں بہت سے پرانے نب بھرے ہوئے تھے ۔ ریڈ انک نب جن سے میں اکثر اپنی کہانیاں لکھتا ہوں اور اکثر ایک کہانی لکھتے وقت تین چار نب استعمال کرتا ہوں اور پھینک دیتا ہوں ۔ اصل میں مجھے ریڈ انک نب کی تیز دھار بے حد پسند ہے ۔ لکھتے وقت ایسا لگتا ہے گویا نب کہانی کے سینے میں اترا جا رہا ہے ۔ ہل کی پھالی کی طرح کسی انجان ان دیکھی دھرتی کو چیرتا ہؤا آگے بڑھتا جا رہا ہے ۔ کسان کی فصل کی طرح کہانی بھی دھیرے دھیرے پکتی ہے : پہلے اس میں کونپلیں پھوٹتی ہیں ، پھر پودا اونچا ہوتا ہے ، پھر اسے ہوا اور روشنی ملتی ہے ۔ پھر آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی نوکیلے پتوں پر بالیاں سرسراتی ہیں ، تب جا کے کہیں محبت کا ایک دانہ پیدا ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی محبت کا ایک دانہ بھی پیدا نہیں ہوتا اور ساری دھرتی بنجر رہ جاتی ہے ۔ اس بنجر کہانی کے گھاؤ کو ایک افسانہ نگار سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا ۔

لڑکے کی ڈبیہ انہیں پرانے نبوں سے بھری ہوئی تھی - جن سے میں نے نئی اور پرانی کہانیاں لکھ دی تھیں - اچھی اور بری کہانیاں جو ازل کی طرح پرانی تھیں - اور آج کے انسان کی مانند نئی تھیں - محبت میں ڈوبی ہوئی کہانیاں - غیض و غضب سے بھرپور کہانیاں ، رنگین بجلی کی مانند چمکتی ہوئی کہانیاں اور بے رنگ پھیکی سیٹھی کہانیاں جیسے بیج اندر سے سڑ جائے اور کہانی کی کوکھ بانجھ ہو جائے - لیکن یہ سب اپنی محنت کی کہانیاں تھیں - ان میں میرے خیالات کا درد اور میرے احساس کا پسینہ شامل تھا - اس لیے میں نے اپنے لڑکے کے خزانے کے قصے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اس سے پوچھا :

" یہ سب کیا ہے ؟ "

لڑکے کو اب میری حماقت کا پورا یقین ہو چکا تھا - اس لیے مسکرا کر بولا : " ارے بھئی یہ نب ہیں -"

میں نے پوچھا : " ان سے تم کیا کرتے ہو -"

وہ بولا : " کچھ نہیں کرتا - میں ان سے کھیلتا ہوں -"

" کیسے ؟ "

وہ بولا : " دیکھو یہ نب ہیں اور یہ ان کا باپ ہے -"

یہ کہہ کر لڑکے نے ماچس کی تیسری ڈبیہ کھولی اور اس میں سے ایک مقناطیس نکالا - مقناطیس نے ایک نب کو اپنے پاس بلا لیا - جب ایک نب آیا تو پھر آہستہ سے باقی نب بھی ایک دوسرے کی انگلی پکڑے مقناطیس سے لگ کر لپٹ گئے -

بچے نے ھنس کر دیکھا ؟ یہ ان کا باپ ہے ، یہ نب اس کے بچے ہیں - ایک دوسرے کی انگلی پکڑے قطار میں کھڑے ہیں ،

سمجھے ؟ "

یکایک میں سمجھ گیا - اتنی کہانیاں لکھنے کے باوجود جو کچھ نہ سمجھ سکا تھا اسے اب سمجھ گیا - یوں تو میں جانتا تھا کہ کہانیاں اچھی ہوتی ہیں اور بری ہوتی ہیں - وہ لمبی ہوتی ہیں اور چھوٹی ہیں ، وہ قسم قسم کی ہوتی ہیں لیکن اب تک یہ نہیں جانتا تھا کہ سب کہانیوں کا ایک ہی مقناطیس ہوتا ہے - جس کے سہارے وہ خلا میں کھڑی ہو جاتی ہیں اور وہ مقناطیس ہے - انسان ! انسان کے بغیر کوئی کہانی کھڑی نہیں ہو سکتی -

مجھے اب بچے کے خزانے میں بہت دلچسپی معلوم ہونے لگی تھی - اس لیے میں نے اس سے کہا : " آگے دکھاؤ اور کیا ہے تمھارے پاس ؟ "

اب لڑکے نے تصویروں کا ایک بنڈل میرے سامنے رکھ دیا - پہلی تصویر کسی مہا راجے کی تھی جس کے گلے میں ہیرے جواہرات کے ہار پڑے ہوئے تھے - میں نے لڑکے سے پوچھا : " یہ بھلا مانس کون ہے ؟ "

لڑکے نے کہا : " یہ گوتم بدھ ہے -"

لڑکے نے شاید اپنی بہن سے کل ہی گوتم بدھ کا نام سنا تھا - یہ نام اسے بڑا ہی عجیب اور نیا لگا - اس نے جھٹ اس نام کو اس تصویر کے ساتھ چپکا دیا اور میں سوچتا ہوں کیا برا کیا - اس ملک میں بچے کیا بڑے لوگ بھی آج تک مہاراجوں کو گوتم بدھ کی طرح " پاک ، صاف ، نیک... دیوتا کے مانند مقدس " سمجھتے ہیں - مجھے کیا پڑی ہے کہ ایک بچے کی غلط فہمی دور

کروں ، بڑا ہو کر خود ہی سمجھ جائے گا ۔

بچے نے ایک اور تصویر نکالی ۔ اس تصویر میں ایک خوبصورت مراٹھی لڑکی ایک پوسٹ آفس میں خط ڈال رہی تھی ۔ میں نے پوچھا : " یہ کیا ہے ؟ "

لڑکے نے کہا : " یہ عورت لیٹر بکس میں خط ڈال رہی ہے اور اس کا گھر لیٹر بکس کے بہت قریب ہے ۔"

" میں نے کہا : " تمہیں کیسے معلوم اس عورت کا گھر لیٹر بکس کے بہت قریب ہے ؟ "

لڑکے نے میری طرف پھر پُر رحم نگاہوں سے دیکھا : "دیکھتے نہیں ہو ، اس کے پاؤں ننگے ہیں جبھی تو بس گھر سے نکل کر جلدی سے خط ڈالنے چلی آئی ہے ۔ دور جانا ہوتا تو چپل پہن کے نہ جاتی ؟ "

میں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے کہا : " ٹھیک ہے ، اب اگلی تصویر نکالو ۔"

ننھے شرلاک ہومز نے ایک اور تصویر میرے سامنے رکھ دی ۔ اس تصویر میں ایک پنجرا تھا ۔ پنجرے میں طوطا تھا ۔ طوطے کے پاس ایک خوبصورت عورت بھڑکیلے کپڑے پہنے اپنے زیورات کا ڈبہ کھولے بیٹھی تھی اور طوطے کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ میں نے پوچھا : " یہ عورت اس طوطے کی طرف کیوں دیکھ رہی ہے ؟ "

بچے نے کہا : " یہ عورت اس طوطے سے پوچھتی ہے بتا میرا موتی کہاں ہے ؟ "

" کہاں ہے اس کا موتی ؟ "

بچے نے غور سے اس تصویر کو دیکھا ۔ موتی پنجرے میں نہیں تھا ۔ طوطے نے کوٹ نہیں پہنا ہؤا تھا ورنہ موتی اس کی جیب میں ہوتا ۔ آخر سوچ سمجھ کر بچے نے کہا : "موتی طوطے کی آنکھ میں ہے ۔ طوطے نے موتی کو اپنی آنکھ میں چھپا لیا ہے ۔"

اب تک میں نے ایسی بہت سی کہانیاں لکھی تھیں جس میں انسان نے اپنی آنکھ میں آنسو کو چھپا لیا تھا لیکن اس طوطے کی کہانی اب تک میں نے نہیں لکھی جس نے ایک موتی کو اپنی آنکھ میں چھپا لیا تھا ۔ جانے کب یہ کہانی لکھی جائے ؟ جانے اور کون اسے لکھے گا ؟ لیکن یہ کہانی ایسی ہے کہ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی پرانی نہ ہو گی بلکہ طوطے کی آنکھ کی طرح چمکتی رہے گی ۔

بچہ اگلی تصویر دکھانے والا تھا کہ اتنے میں اس کی ماں نے آ کر کہا ، " ننھے اٹھو ! نو بجنے والے ہیں ، تمھیں اسکول جانا ہے ۔"

ننھے کو جھٹکا سا لگا ، مجھے بھی لگا ۔ ہم ایسی خوبصورت دنیا میں تھے جہاں اسکول کا نام لینا بھی گناہ تھا ۔ اور اسکول بھی کیسا اسکول : تنگ کمرے ، اندھیرے دالان ، غریبی کی تلخ یادوں کا مارا ہؤا مفلس ماسٹر اور اس کی نفرت اور غصے سے بھرپور چھڑی ۔ یہ نفرت جو کہیں دور سے آتی تھی ، لیکن آترتی ہمیشہ بچوں پر تھی ۔

ننھا سہم گیا ۔

میں بھی سہم گیا ۔

لیکن کیا کیا جائے ، مجبوری تھی ۔ اسکول جانا ضروری

تھا - بچے نے میری طرف دیکھ کر بڑی بے بسی سے کہا :
" اسکول ـ اسکول نہ جاؤں تو کیا ہو گا ؟ "

ماں نے کہا : " تم اسکول کیوں نہ جاؤ گے ؟ آج تو چھٹی نہیں ہے -" بچے نے پوچھا : " آج کیوں چھٹی نہیں ہے - کل بھی چھٹی تھی ، پرسوں بھی تھی - آج کیوں نہیں ہے ؟ "

میں نے کہا : " روز روز چھٹی نہیں ہوتی -"

وہ بولا : " کیوں نہیں ہوتی ؟ "

ماں نے اسے میری گود سے اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا :
" ہوں... اب سیدھے اسکول چلے جاؤ... بہانے نہ بناؤ -"

لڑکے نے اپنے سامنے دو بے رحم انسانوں کو دیکھا - ہمارے چہروں پر اسے کہیں وہ رنگین تتلی نہ دکھائی دی - نہ وہ لمبے کانوں والا خرگوش نہ ننگے پاؤں گھومنے والی مراٹھی لڑکی — اس نے بڑی اداسی سے ہمارے دو چہروں کی بے رحمی کو پڑھ لیا اور مایوس ہو کر اپنا بستا باندھنے لگا - اور اس بستے میں ایسی ہی کتابیں تھیں جو ہمارے چہروں کی طرح سخت اور بے رحم تھیں - بچہ بہت کچھ چاہتا ہے ، وہ بہت کچھ کہہ سکتا ہے - لیکن اسے بہت کچھ نہیں ملتا کیونکہ وہ بچوں کی دنیا نہیں ہے - یہ بوڑھوں کی دنیا ہے اور بے ایمان ، بدکار اور بدمعاش لوگوں کی دنیا ہے جس کے منہ میں دانت ہے نہ پیٹ میں آنت - وہ بچہ اپنی تصویروں میں اس دنیا کو ڈھونڈتا ہے جو بچوں کی طرح مسکرا سکے- اس لیے بچے نے چپ چاپ بستہ باندھ لیا ، بغل میں دبا لیا ، اپنے خزانے کو اپنی جیبوں میں ٹھونس لیا اور ہماری طرف دیکھے بغیر پڑھنے کے لیے چلا گیا -

بچے کا اسکول گھر کے بہت قریب تھا ۔ گھر سے اسکول تک آدھا فرلانگ سے بھی کم سڑک ہوگی جس کے ایک طرف ایک امیر آدمی کے بنگلے کی لمبی دیوار چلی جاتی تھی اور دوسری طرف گل مہر کے پیڑوں کی قطار تھی ۔ ان دونوں کے بیچ کی سڑک پر میرا لڑکا چپ چاپ سر جھکائے ہوئے اسکول جا رہا تھا کہ میں نے ایک پیڑ کے پیچھے سے نکل کر اس کا راستہ روک لیا ۔

لڑکے نے میری طرف دیکھا ۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ اس سے دھیرے سے کہا : " آؤ اسکول سے بھاگ چلیں ۔"

اسکول سے بھاگنے کی بات ابھی تک بچے کے دماغ میں نہ آئی تھی ۔ یکایک اس کا چہرہ اس خیال کی روشنی سے بھر گیا ۔ یہ روشنی اس کی آنکھوں میں چمکنے لگی ۔ اس کے اُداس رخسار پھول کی طرح کھل گئے ۔ میں اس کے چہرے کا بدلا ہؤا رنگ دیکھ رہا تھا ۔ اس کی حیرت اور پھر امید اور خوشی سے بھرپور راگ کو سن رہا تھا ۔ بچے کا خاموش چہرہ بھی خوشی کے کیسے کیسے گیت گاتا ھے ۔

اس نے اُچھل کر میری اُنگلی پکڑ لی ۔ پھر چلتے چلتے یکایک رک گیا ۔ میری طرف سنجیدگی سے دیکھ کر بولا : " ماں سے نہیں کہو گے ؟ "

میں نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر کہا : " شش ... "

ڈھاک کے ایک پیڑ کے آگے جہاں بہت سے بیریوں کے جھنڈ تھے وہاں ہم نے بستے کو اچھے طرح چھپا دیا اور پھر ہم گھوم کر ایک تنگ سی پگڈنڈی پر ہو لیے جو جنگل سے دور

ناریل کے ایک جنگل میں سے گزرتی تھی -

اس دن ہم بہت گھومے - وہ صبح بھی بہت صاف اور چمکیلی تھی - جنگل میں چاروں طرف سناٹا تھا - ایک طرف ہلکی ہلکی ہرے رنگ کی ٹھنڈی روشنی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی - ہم دونوں ننگے پاؤں دھرتی پر چل رہے تھے کیونکہ میں بھی مراٹھی لڑکی کی طرح جلدی سے ننگے پاؤں ہی گھر سے بھاگ آیا تھا - بہت دنوں بعد آج میرے ننگے پاؤں دھرتی پر چل رہے تھے اور بچپن کے پرانے جانے پہچانے کنکر میرے پاؤں سے گلے مل رہے تھے - میرے پاؤں میں ایک عجیب خوشی کا احساس رچتا گیا اور میں اپنے بچے کو ساتھ لیے جنگل میں دوڑتا گیا -

بچے کو جنگل کی مسرت بخش روشنی بے حد پسند آئی ، بولا :

" یہاں دن ہے ؟ "

میں نے کہا : " ہاں دن ہے -"

" ہمارے گھر میں بھی دن ہے ؟ "

میں نے کہا : " ہمارے گھر میں بھی دن ہے - اس وقت سب گھروں میں دن ہے -"

اس نے پوچھا : " دن میں رات نہیں ہوتی ؟ "

میں نے کہا : " پگلے دن میں رات نہیں ہوتی -"

لڑکے نے ضد سے پوچھا : " تھوڑی سی بھی نہیں ہوتی ؟"

میں نے پریشان ہو کر کہا : " کیا فضول سوال کر رہے ہو - بھلا دن میں رات کیسے ہو سکتی ہے -"

لڑکے نے کہا : " اس وقت دن ہے تو ہمارے مالی کے گھر میں رات کیوں ہے ؟"

میرے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ گئی اور مجھے اپنے بنگلے کے باہر مالی کا جھونپڑا یاد آیا جہاں دن کو بھی رات ہوتی ہے اور دوپہر میں بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے اور مجھے مالی کا گھر اور بہت سے دوسرے گھر یاد آئے جہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا ہے - اور پھر مجھے فلک بوس عمارتیں یاد آئیں جہاں رات کو بھی دن ہوتا ہے - ایسے گھر جہاں تھوڑا سا دن اور لمبی سی رات ہوتی ہے - ایسے گھر جہاں تھوڑی سی رات ہوتی ہے اور لمبا سا دن ہوتا ہے - شاید یہ بچہ سماجی تجزیہ نہیں کر سکتا - لیکن اگر بچہ ارسطو اور افلاطون نہیں ہوتا تو وہ ان فلسفیوں کی طرح بھی نہیں ہوتا جو دن میں رات اور رات میں دن کی عجیب و غریب تاویلیں پیش کر سکتے ہیں - لیکن ایک بچے کو کسی طرح مطمئن نہیں کر سکتے جو دن میں رات اور رات میں دن کو دیکھتا ہے اور اس تضاد پر تعجب سے چپ رہ جاتا ہے -

میں بچے کے سوال کا جواب نہ دے سکا کیونکہ میرا جواب بہت لمبا تھا اور میرا بچہ بہت چھوٹا تھا اور سامنے اب چھوٹی سی ایک ندی آ گئی تھی اس لیے میں نے بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اسے ندی کے پار ایک اونچے ٹیلے پر لے گیا جہاں ایک چرواہا بہت سی گائے بھینسوں کو چرا رہا تھا - بچے نے ایک دو گائے بھینسیں تو ضرور دیکھی تھیں مگر اتنی ساری گائے بھینسیں آج پہلی بار دیکھی تھیں - اس لیے پہلے تو وہ بڑی حیرت سے ان کو تاکتا رہا - پھر بولا : " یہ سب گائے بھینسیں ہیں ؟"

" ھاں ۔"

" اور وہ کیا ھیں ؟ "

" وہ بکریاں ھیں ۔"

" بکریاں ؟"

" ھاں ۔"

" اور وہ کیا ھیں ؟ "

" وہ بھیڑیں ھیں ۔"

" بھیڑیں ؟ "

" ھاں ۔"

میں نے بچے کا تعارف دو تین ننھے منے بکری اور بھیڑ کے بچوں سے کرا دیا ۔ بچہ ان سے کھیلتا رھا ۔ پھر اس نے ایک بچھڑے کو گائے کے تھن سے دودھ پیتے دیکھا ۔ بچہ سمجھ گیا ۔ بولا : " یہ ماں کا دودھ پیتا ھے ۔"

میں نے کہا : " ھاں ۔"

بچے نے پوچھا اور جو ھمارے گھر دودھ آتا ھے ، وہ کہاں سے آتا ھے ؟ "

" انھیں گائے بھینسوں کا دودھ ھوتا ھے ۔"

اس دودھ کو یہ لوگ بچھڑے کے منہ سے نکال لیتے ھیں ؟"

میں نے کہا : " نہیں منہ سے نہیں نکال لیتے ، دودھ دوہ لیتے ھیں ۔"

" کیسے دوہ لیتے ھیں ؟ "

میں نے چرواھے کو چونی دی اور اس نے ایک گائے کو دوہ کر دکھا دیا ۔ نہ صرف دودھ دوہ کے دکھایا بلکہ اس نے بچے

کو اپنی گود میں اس طرح بٹھایا لیا جس طرح وہ گائے دوہتے وقت مٹکی کو اپنے گھٹنوں میں رکھتا تھا ۔ پھر اس نے گائے کے تھن کی دھاریں بچے کے منہ میں ڈالیں ۔ بچے کو بہت لطف آیا اور جب دودھ کی دھار غلطی سے بچے کے چہرے پر بکھر گئی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا ۔ اس نے مجھ سے دھیرے سے کہا : " بڑا ہو کر میں بھی اسی طرح چرواہا بنوں گا ۔" تھوڑی دیر کے بعد ہم چرواہے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ۔ اب ہم وہاں پہنچ گئے جہاں سے سمندر نزدیک تھا اور ایک چھوٹا لڑکا جو میرے لڑکے سے پانچ چھ سال بڑا ہوگا بڑے اطمینان سے کیچڑ اور پانی میں کھڑا ہو کر کیکڑے پکڑ رہا تھا ۔ بچے کو کیکڑے پکڑنے والے بچے کی بہادری بہت پسند آئی ۔ کتنے اطمینان سے وہ کیکڑے کو اپنے ہاتھ سے اٹھا لیتا تھا ۔ اس کے سامنے کے دو بازو الگ کرکے انھیں توڑ توڑ کر وہاں دھاگے باندھ کر اپنی جھال والی بھوری پیٹی میں ڈال دیتا تھا ۔ میرا لڑکا بڑے انہاک سے اس کام کو دیکھتا رہا اور جب وہاں سے چلے اور بہت دور آگے نکل گئے تو لڑکے نے ٹھنڈی سانس بھر کر مجھ سے کہا : " میں بھی بڑا ہو کر کیکڑے پکڑا کروں گا ۔"

جنگل میں گھومتے ہوئے نئے نئے پیڑوں ، پھولوں اور تتلیوں سے متعارف ہوتے ہوئے ہم لوگ ایک پرانے مندر کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے ۔ یہ بہت پرانا مندر تھا اور اس کی چھت ٹوٹی ہوئی تھی اور وہاں سے آسمان نظر آ رہا تھا ۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہمیں پتھر کا ایک بہت بڑا بیل دکھائی پڑا جو مندر کے باہر بیٹھا تھا ۔

لڑکے نے کہا : " یہ بیل ہے نا ؟ "

" ھاں ۔"

" یہاں کیا کر رھا ھے ؟ "

میں نے کہا : " مندر کے سامنے آرام کر رھا ھے ۔"

" یہ مندر ھے ؟ "

" ھاں ۔"

" مندر کیا ھوتا ھے ؟ "

" مندر میں پوجا ھوتی ھے ۔"

" پوجا کیا ھوتی ھے ؟ "

میں چپ ھو گیا ۔ اسے کیا بتاتا کہ پوجا کسے کہتے ھیں کیونکہ بھگوان اور خدا کا خیال تو بہت بعد کی چیز ھے ۔ پہلے تو بچہ دودھ پیتا ھے ، ماں کا چہرہ دیکھتا ھے ، گھٹنوں کے بل چلتا ھے اور پھر بولنا شروع کرتا ھے ۔ پہلا لفظ جو ھو سکتا ھے وہ آپا اور ماں اور پانی اور روٹی کے کھلونے کے نام ھوتے ھیں اور بھائی بہنوں کے پیار ھوتے ھیں ۔ اس ننھی چھوٹی سی پیاری دنیا میں پوجا اور بھگوان کا خیال نہیں کھبتا ۔ اس لیے میں نے بچے سے کہا :

" مجھے بھی معلوم نہیں ۔ لیکن آؤ اندر چل کر دیکھیں پوجا مندر میں کیسے ھوتی ھے ؟"

ھم مندر کے اندر چلے گئے ۔

مندر کی ٹوٹی پھوٹی عمارت کے اندر بہت سی مورتیاں ٹوٹی پڑی تھیں ۔ بندروں کی مورتیاں اور ھاتھی گھوڑوں کی مورتیاں —یہ مورتیاں بے حد خراب حالت میں دیواروں کے آس پاس پڑی تھیں اور اب ان پر جھاڑیاں بھی اگ آئی تھیں ۔ مندر کے وسط

میں جہاں بڑی مورتی کو ہونا چاہیے تھا وہاں صرف پتھر کا ایک کنول پھول باقی رہ گیا تھا جس کے گھیرے میں چڑیوں نے ایک گھونسلا بنا رکھا تھا ۔ اس گھونسلے کے اندر تین بڑے ہی خوبصورت انڈے رکھے ہوئے تھے۔ نازک نازک نیلے رنگ کے تین انڈے جن پر جامنی رنگ کے دھبے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتے تھے ۔

بچے نے خوشی سے چلا کر ایک انڈے کو ہاتھ میں اٹھا لیا ۔ بچہ بے حد خوش تھا ۔ وہ خوشی سے اچھل رہا تھا اور انڈے سے پیار کر رہا تھا ۔ وہ کبھی اسے چومتا ، کبھی گال سے لگاتا اور کبھی خوش ہو کر میری طرف دیکھتا ۔ گویا اسے دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو ۔ اس کی خوشی مجھ تک پہنچی اور میرا دل بھی ایک عجیب مسرت و انبساط سے بھر گیا ۔

تھوڑی دیر کے بعد بچے نے اس انڈے کو اٹھا کر اپنی نیکر کی جیب میں ڈال لیا ۔ اب دوسرا انڈا اٹھانے لگا کہ میں نے روک دیا ۔

" کیوں ؟ " لڑکے نے پوچھا ۔

" یہ انڈے ہمارے نہیں ہیں ، یہ انڈے اس مندر کے ہیں ۔"

لڑکے نے دریافت کیا : " یہ پوجا کے انڈے ہیں ؟ "

" ہاں ۔" میں نے خوش ہو کر کہا ، " یہ پوجا کے انڈے ہیں ۔"

" ان انڈوں کو گھونسلوں میں رکھ دو ۔ پھر ایک چڑیا یہاں گاتی ہوئی آئے گی اور ان انڈوں کو اپنے پروں میں سمیٹ لے گی اور پھر وہ گیت گائے گی اور گیت گائے گی... اور گیت گائے گی

اور مندر کی ٹوٹی ہوئی چھت سے آسمان مسکرائے گا۔ پھر اس کے پروں کا دامن پیار کی سنہری خوشی سے بھر جائے گا۔"

بچے نے خوش ہو کر کہا: "تب پھر پوجا پوری ہو جائے گی؟"

"ہاں پوجا پوری ہو جائے گی۔"

بچے نے خوش ہو کر انڈوں کو واپس گھونسلے میں رکھ دیا۔ اسے یہ پوجا بہت پسند آئی تھی۔ مجھے بھی اصل میں آج ہی معلوم ہؤا کہ پوجا صرف بھگوان کو نہیں کہتے، پوجا ماں کو کہتے ہیں اور تخلیق کے عمل کو کہتے ہیں اور زندگی کے پیار کو کہتے ہیں۔

بچہ چلتے چلتے تھک گیا اور پھر میں نے اسے اپنی بانہوں میں اُٹھا لیا اور چلتے چلتے اسے پریوں کے دیس کی ایک خوبصورت سی خواب کے مانند دھندلی کہانی سنانے لگا جسے سنتے سنتے بچہ میرے شانے سے لگ کر سو گیا۔

پھر واپس آ کر میں نے بیری کے جھنڈ سے اس کا بستہ اُٹھا لیا اور بازوؤں کو نیچے کر کے میں نے اپنے سوئے ہوئے بچے کا پرامید چہرہ دیکھا اور اس کے بھولے چہرے میں مجھے اپنے بچپن کا عکس نظر آیا اور وہ دن یاد آیا جب میں اس طرح ایک اندھیرے سے اسکول اور ایک ظالم اُستاد کے ڈر سے اسکول سے بھاگا تھا اور پھر مجھے اپنی زندگی کی بہت سی تلخ باتیں یاد آئیں اور پھر مجھے ارد گرد کی زندگیوں کی لاکھوں چھوٹی چھوٹی تلخیاں یاد آئیں جن کے گنجان پرخار راستوں سے گزر کر لاکھوں بچوں کے پاؤں چھلنی ہو چکے تھے۔ وہ دن جو راتوں

کی طرح کالے تھے وہ موتی جسے لالچی طوطوں نے اپنی آنکھوں میں چھپا لیا تھا ۔ وہ تصویر جنھیں کوڑھ کے مارے ہاتھوں نے دھبے دار بنا دیا تھا ۔ کتنی ہی لمبی تلخ کہانیاں تھیں جو بچپن کے چہروں پر لکیروں اور جھریوں کا ایک لمبا جال پھیلاتی چلی گئی تھیں ۔

کہتے ہیں کہ پریوں کے دیس میں ہر ایک کی خواہش پوری کی جا سکتی ہے ۔ اگر یہ حقیقت ہے تو میں اس پریوں کے دیس کے بچے کو اپنی گود میں اٹھا کر اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہوں اور چاہتا ہوں اس بچے کی کہانی ہماری نسل کی کہانی سے مختلف ہو ، اچھی ہو ۔ اس کی کہانی ایک ایسے زمانے کی کہانی ہو جس میں یہ بچہ اپنا چہرہ دیکھ سکے اور بچوں کی طرح مسکرا سکے ۔

اس کے بعد میں اپنے خوابیدہ بچے کو چوم لیتا ہوں اور اسے کندھے سے لگا کر گھر کی جانب چل دیتا ہوں ۔

آج آسمان بہت نیلا ہے اور میرے سر کے اوپر گل مہر کے پھول ہیں ۔

سرِ راہے — مسعود مفتی

مسعود مفتی جس ہنر مندی سے ہماری روزمرہ زندگی کے مضحک پہلوؤں کی تصویر کھینچتے ہیں وہ صرف ہنسنے پر ہی نہیں سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ ۲/۵۰
(۱۹۶۴ء کی خوبصورت ترین کتاب) مجلد -/۶

ایک چادر میلی سی — راجندر سنگھ بیدی

پنجاب کے ایک سکھ گھرانے کے افراد کی زندگی کا ایسا نقشہ ہے جس میں زندگی کی ساری حرارت دھکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حقیقت نگاری کا ایسا جچا تلا کمال آردو ادب میں اس سے پہلے نایاب تھا۔ واقعہ ہے کہ یہ ناولٹ ہمارے ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے جس پر کلاسیک کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ مجلد -/۵ (ساہتیہ اکیڈمی انعام یافتہ) ۲/۵۰

شبستان — شکیل بدایونی

''جگر اور فراق کے بعد آنے والی پود میں شکیل بدایونی واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنے فن کے لیے غزل کا میدان منتخب کیا ہے اور اس قدیم مگر جامع اور دلکش صنفِ سخن کو، جس میں ہمارے ماضی کا بہترین ادبی اور تہذیبی اثاثہ محفوظ ہے، نہ صرف اپنایا ہے بلکہ اسے زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات اور جدید تصورات سے ہمکنار کر کے اس میں نئے رنگ بھی بھرے ہیں۔''

ساحر لدھیانوی

شبستان میں رعنائیاں اور صنم و حرم کی غزلوں کے انتخاب کے ساتھ کلام تازہ اور شکیل کے مشہور اور مقبول فلمی گیتوں کا انتخاب بھی شامل ہے۔ -/۲